مجلسِ ادارت

جلد ۷۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ادھر کئی مہینوں سے علم وادب کے اکابر کی موت کا ایسا سلسلہ قائم ہے کہ کوئی مہینہ ناغہ نہیں جاتا جس میں کسی نہ کسی صاحب علم کا ماتم نہ کرنا پڑتا ہو، ان میں سب سے بڑا حادثہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی وفات کا ہے، اگرچہ انکی عمر نوے سال سے زیادہ ہو چکی تھی، مگر وہ ہماری مشترک تہذیب کی بڑی اہم یادگار تھے، اور انکی موت سے اس کا ایک بڑا ستون گر گیا، ان کی ذات میں اس تہذیب کی تمام خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں، اردو زبان سے ان کو عشق تھا، اور اس کے وہ بڑے ماہر و محقق تھے، اور اس کی باریکیوں پر انکی بڑی گہری نظر تھی، جس پر ان کی نثر و نظم کی تصانیف شاہد ہیں، اس لیے ان کی موت ایک بڑا ادبی و تہذیبی حادثہ ہے۔

———— . ————

وہ نصف صدی سے زیادہ اپنے قلم و زبان سے اردو کی خدمت کرتے رہے، اور سرد و گرم کسی دور میں بھی ان کا قدم پیچھے نہ ہٹا، حتی کہ اس دور میں بھی جبکہ فرقہ پرستی نے اردو کی حمایت کو ایک قومی جرم بنا دیا ہے، اور ہندوستان میں جو لوگ اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور دل سے اس کے حامی ہیں، وہ بھی بہت کم اسکے اظہار کی جرأت کر سکتے ہیں، اردو کی وفاداری پر جو لوگ قائم رہ گئے ہیں، ان میں پنڈت کیفی سب میں نمایاں تھے، وہ برابر اسکے لیے سینہ سپر رہے، اور جبتک ان میں لکھنے پڑھنے اور چلنے پھرنے کی سکت باقی رہی اسکی وکالت کرتے رہے، انجمن ترقی اردو ہند کے نائب صدر تھے مگر ادھر چند سال سے ضعف پیری نے بالکل معذور کر دیا تھا، انکی پوری زندگی علمی و ادبی مشاغل میں گذری، اور اردو زبان اور اسکے شعر و ادب کے متعلق بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، اخلاق و سیرت میں قدیم شرافت و وضعداری کا نمونہ تھے، اسلیے انکی موت تنہا علمی و ادبی نہیں بلکہ تہذیبی اور قومی حادثہ بھی ہے، جدید ہندوستانی قومیت کی تعمیر جن عناصر سے ہو رہی ہے اس میں ایسے نمونوں کی پیدا ہونے کی قطعاً امید نہیں،

یادگار زمانہ تھے یہ لوگ
سن رکھو تم، فسانہ تھے یہ لوگ

———— . ————

دوسرا حادثہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی وفات ہے، وہ حضرت شاہ پیر محمد عطا سلونوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے، اور موجودہ سجادہ نشین شاہ نعیم عطا صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔

یہ خاندان علم و عرفان دونوں کا جامع رہا ہے، شاہ حلیم عطا صاحب بڑے وسیع النظر عالم اور اسلامی علوم کا زندہ کتبخانہ تھے، خصوصاً حدیث اور اس کے متعلقہ فنون پر انکی نظر اتنی گہری اور وسیع تھی کہ اس دور کے علماء میں اس کی مثالیں کم ملیں گی، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کے علم کی تھاہ نہیں ملتی، اور اس علم و فضل کے ساتھ ایسے خاکسار اور متواضع، سادہ مزاج اور بھولے بھالے تھے کہ انکو دیکھکر کوئی شخص مشکل سے ان کے لکھے پڑھے ہونے کا بھی گمان کر سکتا تھا، اپنے سے کمتر علم والوں کی باتیں اس شوق اور توجہ سے سنتے تھے کہ معلوم ہوتا خود استفادہ کر رہے ہیں، حافظہ حیرت انگیز تھا، کتابوں کے صفحوں کے صفحے زبانی یاد تھے، مگر ان کمالات کے ساتھ قوت گویائی اور قوت تحریر نہ تھی، اس سے بھی زیادہ انکی تواضع اور استغنا نے انکو نام و نمود سے بے نیاز کر دیا تھا، اس لیے ایک محدود حلقہ کے سوا علمی دنیا بھی ان کے کمالات سے واقف نہ ہو سکی، تقریباً دس پندرہ سال سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں حدیث نبوی کا درس دیتے تھے، اور اسی مبارک شغل میں چند دنوں فالج میں مبتلا رہ کر انتقال کیا، انتقال کے وقت ۵۷ سال کی عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس پیکر علم و اخلاق کو اس کے پاک شغل کے طفیل میں عالم آخرت کی سربلندی عطا فرمائے۔

———— . ————

ابھی یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ اعظم گڈھ کی نامور اور صاحب کمال شخصیت مولوی اقبال احمد خانصاحب سہیل نے وفات پائی، وہ علامہ شبلی مرحوم کے خاص تلامذہ میں تھے، اپنے زمانہ کے نامور علیگ، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ماہر تھے، قوت حافظہ اور ذہانت و ذکاوت میں بے مثال، اردو کے نکتہ سنج ادیب اور اردو فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، قصیدہ گوئی اور نعت و منقبت نگاری میں اس زمانہ میں ان کا جواب نہ تھا، ان کا فارسی کلام ایران کے قدیم اساتذہ کے کلام کی ہمسری کرتا تھا، علمی قابلیت اور ذہانت کے لحاظ سے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، مگر وکالت کے پیشہ نے ان کے جوہروں کو چمکنے نہ دیا، اگر وہ کسی علمی شعبہ میں ہوتے تو ہندوستان کے مشاہیر اہل علم میں ان کا شمار ہوتا، دار المصنفین سے ان کے تعلقات بڑے گوناگوں اور گہرے تھے، اللہ تعالیٰ اس مداح رسول اور منقبت نگار صحابہ کو آخرت کے انعام سے سرفراز فرمائے، ان محدود صفحات میں ان کے تفصیلی حالات کی گنجایش نہیں ہے، انشاء اللہ آیندہ ان پر مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

———— . ————

صوبوں کی حد بندی کے کمیشن کی رپورٹ شائع ہو گئی، اس میں صوبائی اور مقامی زبانوں اور لسانی اقلیتوں کی حیثیت اور ان کے حقوق کا سوال آنا ناگزیر تھا، چنانچہ کمیشن نے ان کے حقوق کے متعلق چند

اصول بنائے ہیں، اور ان کے مطابق حقوق کی سفارش کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ اترپردیش میں اردو کے حق کا تھا، جو ہندوستان کے دستور میں ہندوستان کی چودہ زبانوں میں ایک زبان مانی گئی ہے، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی علاقہ تک متعین نہیں ہے، کمیشن نے بھی اس بارہ میں سکوت سے کام لیا ہے، اور اردو کا نام تک نہیں آنے پایا ہے، حالانکہ کمیشن کے صدر جسٹس فضل علی اور اس کے ایک رکن پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس صوبہ میں اردو کی حیثیت سے پوری طرح واقف ہیں، اور کنزرو صاحب تو اس وفد کے بھی رکن تھے جس نے صدر جمہوریہ کی خدمت میں اردو علاقائی زبان کا بیس لاکھ دستخطوں کا میمورنڈم پیش کیا تھا، مگر اردو کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے، کمیشن نے جن اصولوں کی بنیاد پر لسانی اقلیتوں کے حقوق کی سفارش کی ہے، اس سے بھی اردو کو مشکل ہی سے فائدہ پہنچ سکے گا، اس کا حال تو شروع سے یہ رہا ہے کہ

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب بیدرد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

چنانچہ اس صوبہ میں اردو کی جڑ کاٹنے کے لیے مدتوں پہلے سے اہتمام کیا گیا تھا، اور گذشتہ مردم شماری میں زبان کے اندراجات نہایت غلط کیے گئے تھے اور اردو بولنے والوں کی تعداد گھٹانے کے لیے اردو اور ہندی کے علاوہ ایک تیسری زبان ہندوستانی کھڑی کی گئی جس سے اس صوبہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد اور بھی کم ہو گئی، اس مردم شماری کے اعداد کی صحت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی رو سے لکھنؤ جیسے اردو کے مرکز میں اردو بولنے والوں کی تعداد کل ۱۵ فیصدی ہے، ایسی حالت میں کمیشن نے جو سفارشیں کی ہیں اس سے بھی شاید ہی کسی ضلع میں اردو کو کوئی فائدہ پہنچ سکے۔

درحقیقت اردو کے بارہ میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے کہ جو لوگ اردو کے واجبی حقوق کے معترف بھی ہیں وہ بھی علانیہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے، اور اترپردیش کی حکومت تو اردو کو قطعاً کسی طرح بھی پنپنے دینا نہیں چاہتی، تاہم قانونی اور اصولی حد تک تو بہرحال اس کے حقوق کے لیے جد وجہد کرنا ہے، حکومت ہند نے ہندی کے متعلق تحقیقات کا جو کمیشن مقرر کیا ہے، اس میں اردو کے متعلق بھی گفتگو کی گنجایش نکلتی ہے اسلیے ضرورت ہے کہ اردو کے تمام مرکزی ادارے اور اس کی علمی و ادبی مجالس اس کے سامنے اس صوبہ میں اردو کی حیثیت اور اس کے حقوق کے بارہ میں مفصل بیانات دیں،

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو سیلاب کے اثرات کے مشاہدہ کے سلسلہ میں ۶ نومبر کو اعظم گڑھ آئے تھے، وہ ہماری مشترک تہذیب کے باقیات صالحات میں ہیں، اس لیے دارالمصنفین بھی تشریف لائے تھے اور اسکے کتبخانہ کو دیکھکر بہت متاثر ہوئے، افسوس ہے کہ انکا قیام مختصر رہا۔

مقالات

سُلوکِ سُلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب محمد اشرف خان صاحب ایم اے لکچرار عربی، اسلامیہ کالج پشاور

(۳)

ہمت و عزیمت اس طریق کے ہر راہی اور اصلاح کے ہر طالب کے لیے ضروری ہے کہ اصلاح نفس کے لیے ہمت و عزیمت سے کام لے، اختیاری امور میں بے ہمتی و کسل اور کوتاہی کو دخل نہ دے، اور غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے، جو شخص ہمت و عزیمت سے کام میں لگا رہے گا وہ انشاء اللہ العزیز ایک نہ ایک دن ضرور مقصد میں کامیاب ہوگا۔

آہی جائیگا کبھی اس تک بھی ساقی دورِ جام منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے

حضرت والا ایک طالب کو لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دیں، انشاء اللہ آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا، اصلاح کا سارا کام عزیمت پر موقوف ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال ہوگا، اور اس سے سارا کام بن جائے گا"

ایک دوسرے صاحب کو تحریر فرمایا: "احساس کا پہلا قدم اپنی گزشتہ غلطی اور تقصیر کا اعتراف اور ندامت اور آئندہ اس کی اصلاح کا عزم بالجزم ہے"

ایک اور طالب کے جواب میں جنھوں نے سوسائٹی کے برے اثرات کی شکایت کی تھی، تحریر فرمایا:

"بری صحبت سے پرہیز کیجیے، اور بزرگوں کے تذکرے پڑھیے، سوسائٹی خدا نہیں کہ اس سے ڈرا جائے، اگر کسی آبادی میں وبا پیدا ہو جائے، تو کیا کثرتِ آبادی کا لحاظ کرکے آپ اپنی بیماری کا علاج چھوڑ دینگے، آجکل سوسائٹی حقیقت میں وبا رسیدہ ہے، آپ سوسائٹی کو جو خدا تعالیٰ سے غافل ہے، قابل رحم سمجھیے، کیا اندھے ننگوں کی صحبت میں کوئی آنکھ والا اپنے لیے برہنگی کو پسند کرے گا، آپ چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں آپ ہیں، وہ جلیل القدر ہے، یہ خیال غلط ہے، جو خدا اور رسول کے خلاف ہو وہ کبھی جلیل القدر نہیں، اور جو جلیل القدر نہیں، وہ لحاظ کے قابل نہیں۔"

ایک طالب نے عمل میں ارادہ کی کمزوری کی شکایت کی، اس کے جواب میں ارقام فرمایا:

"پختہ ارادہ عزیمت سے پیدا ہوتا ہے، عزیمت کیجیے، جس طرح آپ کو کہیں ریل میں جانا ہوتا ہے تو کیسے جاتے ہیں، صرف تمنا سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، عمل کیجیے، فرائض پر عامل ہوں، اور نوافل کو بھی ادا کرنے کی کوشش اور، تہجد کا اہتمام کیجیے۔"

ایک دوسرے صاحب کی اسی قسم کی شکایت پر تحریر فرمایا:

"سستی کا علاج تو بقول حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ چستی ہے، جب تک دل میں وہ ہمت و عزیمت پیدا نہ کرینگے، جو دنیاوی کاموں کے کرنے میں دیکھی جاتی ہے، دین کے کام انجام نہیں پا سکتے ہیں، بلا وجہ سستی کوئی شرعی عذر نہیں، اس محرومی کی اہمیت کو محسوس کیجیے جو جماعت کی محرومی سے ہوتی ہے۔"

ایک دوسرے گرامی نامے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کو جب اپنی اصلاح کی فکر لاحق ہوئی ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی حالت روز بروز درست ہوتی جائے گی، وقت کی پابندی کے بغیر استقامت حاصل نہیں ہوتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج کے اوقات مقرر فرمائے ہیں، پابندی کے بغیر مداومت اور استقامت نصیب نہیں ہوتی، جس طرح بیمار جب تک پابندی کے ساتھ دوا نہیں پیتا عموماً تندرست نہیں ہوتا...... اللہ تعالیٰ

اپنے فضل و کرم سے آپ کو توفیق اور ہمت عطا کریں، سب سے پہلے بندہ آمادگی ظاہر کرے تو اللہ تعالیٰ نصرت فرماتے ہیں، بے ہاتھ اٹھائے تو لقمہ بھی منہ تک نہیں پہنچتا، اپنی جیسی کوشش عزیمت کے ساتھ کیجیے، پھر تائید الٰہی انشاء اللہ تعالیٰ شامل حال ہوگی۔"

ایک اور مکتوب میں تحریر فرمایا: "آپکے حالات معلوم ہوئے، امور خیر کی تعمیل اور گناہوں سے بچنا انسان کے اختیار میں ہیں، بس آپ سب وسوسوں اور خیالات کو چھوڑ دیں، اور دل سے یہ طے کر لیں کہ آج سے اللہ تعالیٰ کے کسی چھوٹے یا بڑے حکم کے خلاف نہیں کریں گے، معمولات کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہیے، وقت کی پابندی کے بغیر معمولات ناغہ ہوتے ہیں، اس لیے وقت کی پابندی کی ضرورت ہے۔"

بہر حال گذشتہ پر ندامت بھی توبہ کا ایک جزو ہے، لیکن صرف یہ ندامت کافی نہیں، ضرورت ہے کہ آیندہ ان لغزشوں سے بچنے کا عزم راسخ ہو جائے۔"

ایک صاحب نے لکھا "باتیں اور ارادے کرتا ہوں، لیکن عمل کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کی دولت سے نوازیں۔"

حضرت شیخؒ نے جواب میں تحریر فرمایا: "عمل کی عزیمت اور پختہ ارادہ اور مستقل ہمت اور دعا کے سوا کوئی تدبیر نہیں ...... نفع کے لیے مداومت شرط ہے، اگر کسی عذر شرعی سے ناغہ ہو جائے تو کچھ حرج نہیں، مگر اہتمام یہ ہو کہ ناغہ نہ ہونے پائے۔"

استقامت | استقامت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "الاستقامة فوق الكرامة" - وہ بھی عزیمت سے حاصل ہوتا ہے، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں: "استقامت عزیمت سے حاصل ہوتی ہے، اور دعا سے۔"

دوسرے گرامی نامے میں ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ دین میں عزیمت عطا فرمائیں، یہ بڑی نعمت ہے، اس کے بغیر استقامت مشکل ہے۔"

ایک خط میں ارقام فرمایا: "حالات میں کوئی تغیر بجانب زوال بحمد اللہ کہ نہیں ہوا، یہی بہت بڑی نعمت ہے، باقی تغیر بجانب کمال تو وہ اس استقامت طریق سے انشاء اللہ تعالیٰ حاصل ہوگا۔"

حضرت والا استقامت و عزیمت کے جس بلند مقام پر فائز تھے، اس کا بیان بھی اس عاجز کی قوت سے باہر ہے، یہاں مثالاً استقامت کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، حضرت سید ی پنڈی میں قلب کے شدید عارضے میں مبتلا تھے، ضعف حد درجہ تھا مگر اس حالت میں بھی معمولات اور نماز با جماعت میں فرق نہ آیا، ایک دن ظہر کے بعد حسب معمول قرآن کریم اور مناجات مقبول پڑھنے کے لیے پلنگ پر بیٹھے، لیکن قوت نے جواب دیدیا، اور نڈھال ہو کر تکیہ پر سر رکھدیا، اور قرآن کریم چھاتی پر پڑا رہا، پھر ہمت کر کے اٹھے اور پورے عزم سے جتنی تلاوت کرنا تھی اور مناجات مقبول کا جتنا حصہ پڑھنا تھا، پڑھا، اس کے بعد پھر ضعف کی وجہ سے پلنگ پر لیٹ گئے اور راقم سے فرمایا "جب حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ (مولانا تھانویؒ) کا وصال ہوا، تو مجذوب صاحب نے حضرت کی پیشانی کو بوسہ دیکر فرمایا تھا، "واہ میرے شیخ کیا زندگی گذار گئے"، اس سے مقصد یہ تھا کہ کیا استقامت کے ساتھ زندگی گذار گئے کہ آخری وقت تک ہر بات کو نبھا گئے، ہمارے حضرت نے فرمایا، اصل چیز تو استقامت ہے کہ آخری سانس تک تراش خراش جاری ہے، حضرت مولانا تھانویؒ اسی لیے یہ شعر بکثرت پڑھتے تھے:

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دمِ آخر دمے غافل مباش

بس آخری سانس تک کوشش جاری رہے کہ شیطان دھوکہ نہ دے۔"

ایک خط میں تحریر فرمایا: "اللہ تعالیٰ استقامت نصیب فرمائیں لیکن ہر وقت اندیشہ لگا رہنا ایک نعمت ہے، اسی سے خوف و رجا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو عین ایمان ہے۔"

ایک گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں: "آپ کے حالات معلوم ہو کر خوشی ہوئی، اسی طرح چلے چلئے، نفس کے فریب سے بچتے ہوئے کہ اس کا فریب اچھے اچھوں کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے، حدیث شریف

میں ہے الحزم سوء الظن: تجربہ کاری سوء ظن کا نام ہے۔

ایک والا نامہ میں یہ حدیث مجھے لکھی تو اس کے ساتھ بنفسہ کا لفظ بڑھا دیا، یعنی تجربہ کاری اپنے نفس کے ساتھ سوء ظن کا نام ہے......"

ایک والا نامہ میں تحریر فرمایا: "جب تک اخیر سانس نہ آئے دغدغہ ہمیشہ لگا رہے۔"

غرض استقامت ایک بڑی نعمت ہے، اور اسی کی برکت سے طریق کی گھاٹیاں پار ہوتی جاتی ہیں۔

توحید

سلوک کا مقصد اعظم اور مدعائے اصلی توحید کاملہ کا ایسا حصول و ایقان ہے کہ توحید محض قولی و نظری نہ رہے بلکہ حال بن جائے کہ "توحید افعالی کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی"۔ جب توحید الٰہی کی حقیقت سالک پر منکشف ہوتی ہے تو سب سے کٹ کر صرف اپنے ایک آقا ہی کا ہو جاتا ہے، اپنا نفع و ضرر، خیر و شر، عزت و ذلت سب کچھ اسی کی ذات سے وابستہ کر لیتا ہے کہ اسکے ماسوا بالکل ہیچ ہے۔

کارفرما ایک آتا ہے نظر منکشف اب رازِ الا اللہ ہے

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے فاعل حقیقی ہونے کا اذعان توحید افعالی ہے، جس کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی، سلوک کے احوال و مقامات اسی توحید کاملہ کی سعی و حصول کا ثمرہ و نتیجہ ہوتے ہیں، جس قدر سالک کا قدم اس توحید کی طرف بڑھتا چلا جائیگا صبغۃ اللہ کے رنگ میں نکھرتا چلا جائے گا، صفات الٰہیہ کا انعکاس اسے فضائل و اخلاق سے متحلی اور رذائل سے پاک بنا دے گا، خشیت و محبت الٰہی کا رسوخ اسے معاصی سے مجتنب، اوامر الٰہی کا پابند اور یاد الٰہی میں مشغول بنا دے گا، غرض من یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراطٍ مستقیم کی نص صریح کی حقیقت اسی توحید کامل کے حصول سے ہاتھ آئے گی کہ اس طریق کا ہر راہی توحید کی ہی مختلف گھاٹیوں و منازل کا جادہ پیما ہوتا ہے۔

اس تجلی گاہ کا ہر نازنیں کشتۂ اندازِ الا اللہ ہے (سید الملۃ)

فنائے تام و عبدیت کاملہ جو طریق کی غایت قصویٰ ہے، اور جس کے متعلق ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پہلا درس اپنے شیخ کی بارگاہ سے ان الفاظ میں ملا تھا کہ[1] "ہم نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے اس کا مقصد اپنے کو مٹانا ہی سمجھا ہے۔ وہ بھی اسی توحید کاملہ کا ثمرہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی جلالت و عظمت چھاتی ہے تو اپنی ہستی کے گمان سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے، اپنے ہیچ در ہیچ اور محتاج و لاچار ہونے کا ایقان اور ہر خوبی و وجود کا ان ہی کی ذات سے ہونے کا یقین غالب و مستحضر ہو جاتا ہے، نگاہوں میں وہی سما جاتا ہے۔ دل اسی کے جلووں سے مسرور اور اس کی رضا و لقا کے جذبات سے معمور ہو کر مخلوقات کو گم کر دیتا ہے، اس وقت بندہ اسی کی قوت سے دیکھتا ہے، اسی سے چلتا ہے، اسی سے سنتا ہے، اسی سے بولتا ہے، اور کائنات کے ذرے ذرے میں اسے جمال ازلی اور نور سرمدی کا پرتو نظر آتا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ اپنے کو مٹانے کی تشریح ان الفاظ میں ارقام فرمائی تھی:

"اپنے کو مٹانا یہی ہے کہ اپنے کسی کمال کو اپنا ذاتی نہ سمجھا جائے، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا بلا استحقاق بندہ سمجھا جائے، اور اپنے کسی عمل کو موثر مستقل نہ سمجھا جائے، دل میں کبر و نخوت و عجب باقی نہ رہے اور یہ حاصل ہوتا ہے اپنے ضعف اور بیچارگی کے تصور اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے استحضار سے۔"

---

[1] حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ نے راقم سے تذکرہ کیا تھا کہ جب سیدی و مولائی حضرت شیخ پہلی مرتبہ مولانا تھانویؒ کی خدمت اقدس میں تشریف لے گئے تو رخصتی کے وقت سید صاحب نے فرمایا حضرت کچھ نصیحت کیجئے، مولانا نے فرمایا "میں اتنے بڑے عالم و فاضل کو کیا نصیحت کر سکتا ہوں"۔ سید صاحب کا نرم و پاکیزہ دل یہ الفاظ سنکر گداز ہو گیا اور آبدیدہ ہو گئے، حضرت مولانا تھانویؒ پر بھی سید صاحب کے اس تاثر سے رقت طاری ہو گئی، اور ارشاد فرمایا "ہم نے جو کچھ دیکھا، پڑھا اور سنا ہے اس کا مطلب فنا و عبدیت ہی سمجھا ہے"۔ میں نے حضرت شیخ (سید صاحب) سے ایک مرتبہ استفسار کیا تھا کہ آپ کی پہلی ملاقات مولانا تھانویؒ سے کس طرح ہوئی تھی، فرمایا بڑی مدت سے خدمت میں حاضری کا خیال تھا، مگر ہمارے احباب اسکو پسند نہیں کرتے تھے، ایک سفر میں لاہور کی واپسی کے بعد بغیر اطلاع کے میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، رخصتی کے وقت حضرت والا (مولانا تھانوی) نے ارشاد فرمایا "ہم نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے، اس کا مقصد اپنے کو مٹانا ہی ہے"۔ (اشرف)

ایک خط میں تحریر فرمایا "تواضع کی کیفیت کی کمی اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے مراقبہ سے دور ہو گی"۔

ایک طالب نے اپنے ارادہ کو ذاتِ حق کے ارادے میں فنا کر دینے کا ذکر کر کے پوچھا کہ یہ اخلاص کے منافی تو نہیں، حضرت سیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا "ارادہ کی یہ فنائیت اخلاص کے خلاف نہیں ہے، ارادہ کی فنائیت یہ ہے کہ بندہ اپنے ارادہ کو مؤثر نہ جانے بلکہ موثر صرف مشیتِ الٰہی کو سمجھے، باقی ارادہ تو فنا نہیں ہوتا جب تک انسان ارادہ نہ کرے کوئی فعل ہی نہیں ہو سکتا"۔

ایک والا نامہ میں لکھتے ہیں: "آپ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر جو حالات لکھے ہیں، وہ سب محمود ہیں، اور ان پر حق تعالیٰ کا جو محسن حقیقی ہے، اکثر شکریہ ادا کیجئے، ورنہ ذرا سا غرور و تکبر اور اپنے نفس کی طرف نظر رکھنے سے سارا کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان شرور سے محفوظ رکھیں، ہمیشہ تواضع، صغرِ نفس اور فنا کا حال غالب رہے، اور ہر وقت یہ سمجھے کہ جو کچھ ہے وہ اس بے استحقاق پر محض ان کا کرم ہے، ورنہ کچھ نہیں ہے"۔

ایک طالب کے سوال کا جواب ان الفاظ میں تحریر فرمایا: "بے شبہ یہی بات ہے، ہمارے اعمال پوست ہی ہیں، انسان جس قدر ترقی کرتا ہے، اپنے احوال و اعمال متوقع مراتب سے کم نظر آتے ہیں، اور یہی صحیح حال ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا" احساسِ نقص نقصان کی بات نہیں، احساسِ کمال نقصان کی بات ہے، بلکہ احساسِ نقص تو ترقی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے"۔

ایک گرامی نامے میں ارقام فرماتے ہیں: "اصلاح کامل تو کسی زمانہ میں بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جیسے جیسے کمال کی طرف آدمی بڑھتا ہے، اس کے نقائص اور زیادہ اس پر واضح ہو جاتے ہیں، مگر بندہ کو چاہیے کہ اپنی کوشش میں لگا رہے"۔

حضرت شیخ کا ایک شعر ہے۔

جب سے اے دل اپنے عیبوں پر نظر اپنی پڑی — اپنے دعوائے ہنر سے شرم سی آنے لگی

اس شعر کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ شعر اہل علم اور مولوی حضرات کے لیے ہے۔"

ایک مرتبہ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا کہ ایک دن نماز کے بعد مولانا نے مقتدیوں کی طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے میری اس دعوت کو فروغ دیا ہے، مجھے اپنے اوپر استدراج کا خطرہ ہے، اس لیے میں سب بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لیے دعا فرمائیں"

ہمارے حضرت نے یہ قصہ نقل کرنے کے بعد فرمایا "ہمارے بزرگ بڑا بننے کو ابتلا سمجھتے تھے کہ کہیں پول نہ کھل جائے۔"

حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ پر فنا و عبدیت کا جس قدر غلبہ تھا، اس کا کچھ ہلکا اندازہ شاید مندرجہ ذیل واقعات سے ہو سکے۔

راقم نے حضرت شیخ قدس سرہ سے ایک مرتبہ تنہائی میں پوچھا کہ حضرت بزرگوں سے فیض کس طرح حاصل کیا جاتا ہے، میرے سوال کا منشا حضرت شیخؒ نے یہ سمجھا کہ میں بزرگی کی نسبت انکی طرف کر رہا ہوں، جس سے چہرۂ اقدس کا رنگ متغیر ہو گیا، اور بے اختیار زبانِ مبارک سے نکلا "یہ تو انانیت ہے۔ لا الٰہ الا اللہ استغفر اللہ" اور ارشاد فرمایا آپ کا کیا مطلب ہے۔ میں نے پھر عرض کیا، فرمایا، جو بزرگ ہوں، ان سے فیض حاصل کرنے کے متعلق حضرت والا مولانا تھانوی رحمۃ اللہ نے یہ طریقہ بتایا تھا، پھر اس کی تصریح فرمائی، اس طرح گویا اپنے متعلق بزرگی کے ادنےٰ گمان تک کو بھی برداشت نہیں فرمایا، فقیر سے فرماتے تھے "جس کے خیال میں اپنی بڑائی کا گمان آئے، وہ اللہ کی محبوبیت کے دائرے سے خارج ہے، (اللھم اعذنا من شرور انفسنا) پھر یہ آیت پڑھی ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً اور فرمایا مختال سے یہی مطلب ذہن میں آتا ہے۔"

راقم نے ایک مرتبہ اپنی دوری و مہجوری کا ذکر کر کے عرض کیا کہ حضرت یہ خادم کی غرض بھی وہی

جو اپنے شیخ کے سامنے پیش کی تھی کہ

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں — ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے

ارشاد فرمایا "یہاں کیا رکھا ہے، اللہ ہی اللہ ہے، یہاں خود پیغمبری وقت پڑا ہوا ہے۔"

حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ پشاور تشریف لائے، راقم نے عرض کیا، حضرت کسی چیز کی تو ضرورت نہیں، ارشاد فرمایا "جی ہاں ہے، ایک چیز کی ضرورت ہے، عرض کیا ارشاد ہو، فرمایا نجات"

ایک مرتبہ در دولت پر حاضری ہوئی، حضرت کمرہ میں تشریف رکھتے تھے، میں نے آنے کی اطلاع دی، آواز سن کر فرمایا آجایئے، اندر گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت والا پر ہیبت کا غلبہ ہے، رنگ زرد ہے اور زبان مبارک سے یہ کلمات نکل رہے ہیں "بڑی پٹائی ہو گی بڑی پٹائی ہو گی" میں گھبرا گیا کہ کہیں مجھ کو تو نہیں سنایا جا رہا ہے، لیکن شیخ محاسبہ کے عالم میں تھے، اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے، "پوچھا جائے گا، ہم نے جو علم دیا تھا، اسے تو نے اپنے لیے استعمال کیا"

سچ ہے، جتنا علم الٰہی بڑھتا ہے، اتنی ہی خشیت بڑھتی ہے، چنانچہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ انا اعلمکم باللہ واخشاکم للہ، نیز ارشاد باری ہے انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

اگر کوئی طالب حضرت کے احسانات و برکات کے متعلق کچھ لکھتا تو فوراً اپنی بے مائگی اور ہیچ میرزی کا اظہار فرما دیتے، کسی نے لکھا "ہر وقت نظر کرم کا طالب ہوں"، جواب میں تحریر فرمایا "نظر رحمت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر چاہیے، انسان کے بس میں کیا ہے، جو کسی انسان کو دے سکے۔"

ایک طالب نے خط میں حضرت کے فیضان کا تذکرہ کیا، اس کے جواب میں تحریر فرمایا "میری نسبت آپ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، وہ صرف آپ کا حسن ظن ہے، باقی ہیچ ہے، ممکن ہے کہ آپ کی طلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ مجکو واسطہ محض بنا کر آپ کو بیش از بیش عطا فرمائیں"

فقیر نے بہت سے آستانوں میں حاضری دی، لیکن جس تواضع و خاکساری اور اپنے ہیچ ہونے کا

عملی مظاہرہ آستانۂ سلیمانی میں دیکھا۔ کہیں نظر نہ آیا۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

بارگاہِ سلیمانی میں جو قدر و منزلت مساکین و فقراء کی تھی۔ وہ امراء و اغنیاء کی نہ تھی۔ فرماتے تھے "امراء اور وزراء سے مل کر قلب پر جو سیاہی آتی ہے، اس کے دھونے کے لیے تالاب چاہئیں"۔ ایک صاحب کو تحریر فرمایا "گوشہ گیری اغنیاء و کبراء سے مناسب ہے، فقراء اور طالبینِ حق سے نہیں"۔

ایک غریب طالب جن کے سوالات اور باتوں سے ہم لوگ بھی تنگ آجاتے تھے، حضرت اقدس دو دو گھنٹے تک پورے انشراح سے ان کی باتوں کو سنتے، اور خندہ پیشانی سے انکے جوابات دیتے اور ان کی تسلی کرتے۔

لاہور کے سفر میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت ناساز تھی، خادم (راقم) ساتھ تھا۔ ایک صاحب نے دو صفحہ کا ایک لمبا خط جس میں اپنی پریشانیاں لکھی تھیں، حضرت کو دینا چاہا، میں نے اس خیال سے کہ حضرت کی طبیعت نڈھال ہے اور ان کا منشا صرف دعا ہے، واپس کرنا چاہا، حضرت نے دیکھا تو باوجود ضعف کے تشریف لے آئے، پورا خط پڑھا، اور ایک دعائے ماثورہ پڑھنے کے لیے لکھ دی۔

حضرت سیدی قدس سرہٗ دارِ منزل کے کمرہ میں عموماً صوفے پر بیٹھتے تھے، باقی حضرات بھی اسی طرح صوفوں یا کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے، حضرت کے خدام میں سے ایک صاحب صوفی ادریس صاحب ہمیشہ زمین پر بیٹھتے۔ ایک مرتبہ میں صوفے پر اور صوفی ادریس صاحب زمین پر بیٹھے تھے کہ ایک صاحب آئے اور صوفی صاحب کو دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئے، اس لیے میں بھی صوفہ چھوڑ کر نیچے بیٹھ گیا، حضرت والا بھی ہم دونوں کو دیکھ کر نیچے بیٹھ گئے۔ اور مزاحاً فرمایا "آپ مجھے گرو بنانا چاہتے ہیں"۔

حضرت والا سے فقیر کا تعلق گو ۱۹۴۳ء سے تھا، خط کے ذریعے بیعت بھی ہو چکی تھی لیکن ملاقات کی سعادت انکی کراچی تشریف آوری کے بعد ۱۹۵۰ء میں حاصل ہوئی، سینہ سے لگایا۔ اور فرمایا "آپ نے

خواب دیکھا تھا ہم آہی گئے"، پھر ارشاد فرمایا "بہتر ہے کہ پہلے ملاقات نہ ہوئی، ورنہ میرے عیوب آپ پر ظاہر ہو جاتے، ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے میرے عیوب آپ سے اتنے عرصہ پوشیدہ رہے" پھر جامی کا شعر پڑھا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

بن دیکھے کی محبت اچھی ہوتی ہے، عیوب کا پتہ نہیں چلتا"۔

وحدت الوجود و وحدت شہود

فنا و عبدیت جس طرح توحید کامل کا ثمرہ ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت حاصل ہوتی ہے تو سالک پر ایسا حال طاری ہو جاتا ہے کہ غیر نظروں سے بالکل محجوب ہو جاتا ہے، اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ اور ہر چیز کا کرشمہ اسی کی ذات نظر آتی ہے، یہانتک کہ وہ اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے، اصطلاح میں اس حال کو "وحدت الوجود" اور "وحدت شہود" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی نو افلاطونی یا غیر اسلامی تعبیریں جو بھی ہوں، مگر اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ غلبۂ حال میں سالک کی نگاہوں سے غیر اللہ بالکل اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غیر معدوم ہو جاتا ہے۔

حضرت سیدی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ "وحدۃ الوجود کو تم قال سے سمجھنا چاہتے ہو، مگر یہ تو حال ہے، جو اکثر سالکین پر طاری ہوتا ہے، اس حال میں غیر معدوم نہیں، بلکہ محجوب ہو جاتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے کمال کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے، جیسے قطرہ جب اپنی ہستی کو دیکھتا ہے تو انا الماء کہنے لگتا ہے، مگر جب سمندر کو دیکھتا ہے تو سمندر کی عظمت کے سامنے اپنا نام لینے سے بھی شرماتا ہے، اور اپنی ہستی کے ہونے کے گمان تک کو گم کر دیتا ہے"، اس تشریح کے بعد سعدی کا یہ شعر پڑھا:

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

غرض حضرت والا کے نزدیک وحدۃ الوجود کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سالکین کو کبھی ایسا حال پیش آتا ہے کہ اس کی نگاہ سے غیر اللہ محجوب ہو جاتا ہے، خود ان کا شعر ہے:

اب مسئلۂ وحدت وکثرت کو میں سمجھا

پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

اس شعر کے متعلق راقم کے استفسار پر فرمایا "محبت کی وجہ سے عاشق کو محبوب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور ہر چیز میں وہی دکھائی دیتا ہے، یہاں بھی یہی چیز مراد ہے، ہر چیز کو اللہ سمجھنا یہ تو وحدۃ الوجود نہیں، بلکہ وحدت کو کثرت قرار دے لینا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی کو غلبۂ حال کی وجہ سے نہ دیکھے۔ وحدۃ الوجود تو یہ ہے"۔

وحدۃ الوجود کی تشریح میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مسعود عالم کو بعض تحریریں لکھی ہیں جن سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے، اسلیے اس کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"وحدۃ الوجود کی بحثیں تمامتر فلاسفہ وحکماء کی الٰہیات میں موشگافیاں ہیں، یا یوں کہیے کہ فلاسفہ کے الٰہیات کے مقابلہ کا علم کلام ہے، شیخ اکبرؒ، صدر قونویؒ، رومیؒ، عراقیؒ، جامیؒ، امام ربانیؒ یعنی مجدد الف ثانی، افضل المحققین (یعنی شاہ ولی اللہ صاحب حسب اصطلاح صاحب طبقات) ان سب کے الگ الگ آرا ہیں یا مختلف تعبیرات ہیں، صاحب طبقات نے ان سب پر تبصرہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان سب میں صرف اصطلاح اور تعبیر کا فرق ہے، حقیقت کا نہیں اور وہی عین شریعت ثابت بالکتاب والسنت بھی ہے، چنانچہ طبقہ ۱۰ اور طبقہ ۲۰ میں اسکی تفصیل مذکور ہے۔

صراط مستقیم میں امام شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الوجود کو محض شدت عشق کا نتیجہ بتایا ہے۔ یعنی شدت عشق واستغراق سے عاشق کو ایسا نظر آتا ہے، جو واقعہ نہیں، اس عشق کا نتیجہ "فنائے علم یعنی غیبت وعدم شعور بما سوائے محبوب حتیٰ کہ بنفس خود (ص۳۶) ہوتا ہے" اس کی تفصیل ص ۱۲ میں ہے کہ جس طرح لوہا آگ میں لال ہو کر انا النار پکار اٹھے لیکن وسط کتاب میں بدعات صوفیہ کے ضمن میں ہے:

"واز جملۂ بدعات ملاحدہ وجودیہ کہ در خواص وعوام اشتہار یافتہ وبا قوال اکابر طریقت مشتبہ گردیدہ گفتگو ہائے توحید وجودی الحادی است کہ بگمان اتحاد خود با خدا از آں لذتیات نفسانی میداوند و تسویل شیطانی ومکر نفوس خبیثہ بیان آں گفتگو و معارف وحقائق می پندارند الخ ص ۸۵" (مکاتیب سید سلیمان ندوی ص ۱۲۸ - ۱۲۹)

دوسرے مکتوب گرامی میں ان ہی کو تحریر فرماتے ہیں:

"وحدۃ الوجود کے باب میں آپ نے کئی دفعہ پوچھا، وحدۃ الوجود کی کئی تشریحات ہیں، اور ان کے اختلاف معنی کی بنا پر حکم بدل جاتا ہے، ان ہی میں سے ایک وہ ہے جس کو جاہل صوفیہ مانتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ خالق ومخلوق میں فرق اعتباری رہ جائے، اور ہر مخلوق کو دعوائے خالقی ہو جائے، سو یہ تمامتر کفر ہے، اور اس کا ماخذ تو افلاطینیت معلوم ہوتی ہے، اور ہندوؤں کا فلسفہ بھی اسی قبیل کا ہے، ہندوستان میں یہ مسئلہ[1] مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی روایت کے مطابق آٹھویں صدی میں آیا، ورنہ حضرات چشت کے کلام میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین سنجری سے لیکر حضرت سلطان الاولیا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ تک کے ملفوظات میں اس کا ذکر یاد نہیں آتا، مجدد الف ثانی، مولانا شاہ ولی اللہ صاحب، مولانا اسمٰعیل شہید وغیرہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی جو تشریح کرتے ہیں، اس کا مقصد مسئلہ قیومیت کی تفصیل ہے، انت قیوم السموات والارض ومن فیھن حدیث صحیح میں وارد ہے، اور اس کی تشریح بہ مذاق وحدۃ الوجود یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنے وجود وبقا میں ہر آن اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں، جس طرح وہ اپنے خلق میں محتاج تھیں، انتم الفقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری حقیقت فقر محض ہے، اور اللہ ھو الغنی

---

[1] فقیر کے سامنے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا، "وحدۃ الوجود کو پہلے پہل سہروردی حضرات ہندوستان لائے، حضرت زکریا ملتانی وغیرہ" واللہ اعلم (اشرف)

سے ظاہر ہے کہ وہی غنی ہے، فقر کے دوسرے معنی عدم کے ہیں، ہماری حقیقت عدم ہے، جس میں وجود یا کسی صفت کی نیرنگی اسی ذات غنی کی صفات کے ظلال ہیں، ظل کی حقیقت عدم ہی ہے، عدم نور کا نام ظل ہے، تاہم کسی ظل کا وجود اصل کے بغیر نہیں ہوتا، اس لیے ظل کا وجود اپنی ذات میں ہم معنی عدم ہے، لیکن اصل کے پرتو سے وجود کا ایک وہمی نقش پالیتا ہے، یہ ان حضرات کا وحدۃ الوجود ہے، گو ہمارے نزدیک حضرت مجدد صاحب کا یہ مسلک آخر مسلک نہیں، آخر مسلک وہی وحدۃ تنزیہہ ہے، جس پر شرع وارد ہے، کما فی المکتوبات۔ ہمارے حضرات کے یہاں وحدۃ الوجود کا تصور ایک حالی کیفیت ہے، جس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت و جلالت اتنی چھا جائے کہ ساری مخلوقات اس کی نگاہوں سے چھپ جائیں، جیسے آفتاب کے طلوع سے سارے ستارے چھپ جاتے ہیں، مگر معدوم نہیں ہوتے، جیسے مجنوں کا یہ قول

تمثل لی لیلی بکل سبیل

جس وحدۃ الوجود کو ہم نے فلاسفۂ افلاطونی کا خیال کہا ہے، یا ہندوؤں سے ماخوذ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ ذات الٰہی ہی پھیل کر عالم بن گئی ہے، جیسے انڈا ہی پھٹ کر چوزہ بن جاتا ہے۔ جو ایک رباعی میں خیام کی طرف منسوب ہے۔

حق جان جہان است و جہاں جملہ بدن | ارواح و ملائکہ حواس این تن
افلاک و عناصر و موالید اعضا | توحید ہمین ست دگر ہا ہمہ فن

ان طویل اقتباسات سے اس مسئلہ کی حقیقت اور حضرت والا کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

صفات الٰہی کا استحضار | اسی طرح جب سالک کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، حکمت، خلق، ملکیت، رزاقی اور قدرت وغیرہ صفات کا یقین پختہ ہوتا ہے تو اس میں تشریعی و تکوینی امور میں اوامر الٰہیہ کی

پابندی، توکل و تفویض، صبر و شکر اور عبدیت تامہ کی صفات خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، ایک طالب نے حضرت والا کو اپنا حال لکھا کہ "بندہ کی عجیب حالت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارادے ختم کرائے جا رہے ہیں۔ بے قصد و ارادہ جو چاہتے ہیں کرا دیتے ہیں، اپنے اختیار میں کچھ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اگر ارادہ کرتا ہوں تو عموماً اس کے فسخ کی اضطراری صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جو چاہتے ہیں کرا دیتے ہیں، ہیچ میرز محض یونہی بے اختیار مختار کل کے ہاتھوں میں ہے"، حضرت شیخؒ نے اس کا جواب یوں ارقام فرمایا کہ

"جی ہاں، تسلیم و رضا کا یہی مقام ہے، خدا کرے کہ یہ حال آپ کا مقام بن جائے

فکر ما در کار ما آزار ما | کار ساز ما بساز کار ما"

مقصد یہ ہے کہ جس قدر صفات الٰہی کی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، انسان توحید کامل اور عبدیت تامہ کی حقیقت سے سرفراز ہوتا جاتا ہے کہ صفات الٰہی میں سے ہر صفت عارف کے لیے قوت و طاقت کا ایک بڑا خزینہ ہے، جس سے ہر آن اس کی تربیت ہوتی ہے، اور اس کے ایمان و یقین کی قوت بڑھتی رہتی ہے، اور عارف کی تربیت صفات باری تعالیٰ اور ذات الٰہی کی خاص بارگاہ سے کیجاتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے یجتبی الیہ من یشاء، اور یختص برحمتہ من یشاء صفاتِ الٰہی کا انعکاس جب بندۂ مومن کے قلب پر ہوتا ہے تو اس پر معرفت الٰہی اپنی ہیچ میرزی اور فقر و احتیاج کی حقیقت کھل جاتی ہے، اور اسے عبدیت کاملہ اور فقر تامہ سے سرفراز کر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کا یقین و مشاہدہ جس طرح بندۂ مومن کی زندگی کو متاثر کرتا ہے، اس کا اندازہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوب سے ہو سکتا ہے، جس میں صفت بصیر کے مراقبہ کے اثر کی تشریح فرمائی گئی ہے، یہ خط گو طویل ہے لیکن اس سلسلہ میں اس کو نقل کرنا مفید ہوگا۔

"مسلمانوں کے عقیدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اللہ تعالیٰ

ہر حال میں دیکھتے ہیں۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار یعنی دنیا میں کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ سب آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں، ارشاد ہے الم یعلم بان اللہ یریٰ ان آیتوں اور بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو دیکھ رہے ہیں، کوئی شخص کتنے ہی رات کے اندھیرے میں ہو، کوئی اسے نہ دیکھ رہا ہو مگر اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے چھپ جانا ممکن نہیں، جس مسلمان سے پوچھو یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن اور ہر جگہ ہے، لیکن بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ حال بن کر ہم پر طاری نہیں ہوا، اگر یہ حال ہو جائے تو کوئی گنہگار گناہ نہیں کر سکتا، جیسے پولیس کی موجودگی کے وقت جرم کی ہمت نہیں ہوتی، اگر یہ عقیدہ ہمارا حال بن جائے تو ہم سے کوئی برائی سرزد نہ ہو، اگر ہم یہ سمجھیں کہ لوگوں سے بچکر چھپ کر گناہ کریں اور ان کے دیکھنے اور شہادت سے بچ جائیں اور اس طرح سزائے الٰہی مامون ہو جائیں تو یہ غلط ہے، ہم لوگوں سے تو چھپ اور بچ سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں بچ سکتے کہ وہ ہر آن و ہر جگہ موجود اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔ انسان اگر اس چیز کو اپنے اندر پیدا کر لے تو تمام برائیوں کا سدباب ہو جائے پس معلوم ہوا کہ ہر قسم کی برائیوں سے بچنا ہو تو اس عقیدہ کو دل کے اندر جما لیا جائے۔

نیت کے بغیر نہ نماز نماز ہے، نہ روزہ روزہ، نیت کے استحضار سے عبادت عبادت بنتی ہے، پس انسان ہر عمل کی نیت کرتے وقت یوں سمجھ لے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، اور کڑی نگہبانی فرما رہے ہیں، اسی طرح اگر اندھیری رات میں چٹان کے نیچے چیونٹی چل رہی ہے تو اسے بھی جانتے ہیں، اگر یہ حال پختہ ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ گناہ کا صدور نہ ہو سکے گا۔

انسان کے شہوات یا جذبات جب ایمان پر غالب آ جاتے ہیں تو جرم ہوتا ہے، اسلیے ضرورت ہے کہ اس عقیدہ کو اس قدر مستحضر کر لیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا دھیان اس طرح غالب ہو جائے کہ شہوات و جذبات کی بنا پر گناہ سرزد ہونے نہ پائے، تمام مسلمان نماز کی نیت کرتے ہوئے اس چیز

کو مستحضر کر لیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں، اور وہ ہمارے قلب کو دیکھ رہے ہیں، یہ استحضار اسی طرح نمازوں میں بڑھتا جائے گا، اور دیکھنے ان اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا ہو جائے گا تو پھر نہیں جائے گا، اور اس حاضر و ناظر ہونے کے یقین کی بنا پر انسان برائی نہیں کر سکے گا، اسی لیے قرآن نے کہا ہے ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ نماز اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے دھیان کو حاصل کرنے کا بڑا وسیلہ ہے۔

جو لوگ اس سے زیادہ کی ہمت رکھتے ہوں، بزرگوں نے ان کے لیے اور کئی طریقے بتائے ہیں، جن میں ذکر اور مراقبہ بھی ہے، کچھ دیر آنکھیں بند کر لے اور سوچے اور تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو دیکھ رہے ہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی ساری زندگی پر اس کا اثر پڑے گا، مراقبہ کا مطلب نگرانی ہے، ان اللہ کان علیکم رقیبا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو جب نگران سمجھکر دھیان کیا جائے گا تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سامنے رہیں گے، اور یہ تصور اس قدر غالب آ جائے گا کہ برائی کا صدور جاتا رہے گا، ایسے تو ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، عیاں اور پوشیدہ اس سے چھپ نہیں سکتے، قرآن میں ہے، دو سرگوشی کرنے والوں میں تیسرا وہ ہوتا ہے۔ وھو معکم اینما کنتم، جب اللہ تبارک و تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو اس عقیدہ کا حال اپنے اوپر کیوں نہ طاری کر لیا جائے، اگر اس عقیدہ کو پختہ کر لیا جائے تو انسان گناہوں سے بری ہو جائے گا، عقیدہ کو عقیدہ کی حد تک نہ رکھیں، بلکہ اپنے پر اسے طاری بھی کر لیں، نماز بے التفاتی سے نہ پڑھیے، بلکہ یہ تصور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، رکوع و سجود و تلاوت کے وقت یہی دھیان ہو۔

الحمد للہ رب العالمین کے وقت یہ تصور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں، انکی تعریف کر رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب اس لیے ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ مستحضر نہیں رہتا، صحابہ کے حال میں لکھا ہے کہ انھیں اکیلے میں بھی برہنہ نہاتے ہوئے حیا آتی تھی، جبکہ انسان برہنہ ہو سکتا ہے، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ

کا دھیان کرکے ان کو اس سے شرم آتی تھی ، صحابہ کا یہ حال اسی بنا پر تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا دھیان اسقدر غالب و مستولی ہوگیا تھا کہ تنہائیوں میں بھی اپنے لیے برہنگی پسند نہیں کرتے تھے،

اللہ تبارک و تعالیٰ ہر شخص کے گناہوں کو جانتے ہیں، لیکن اس پر فرشتوں کی شہادت قیامت میں پیش کریں گے، جن اعضاء کے لیے ہم گناہ کرتے ہیں، وہی ہم پر گواہی دیں گے اور یوں کہیں گے: "انطقنا اللہ الذی انطق کل شیٔ" پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ شراب خانہ کی طرف گیا تھا، بری نگاہ کی آنکھ گواہی دے گی، آج ہم آنکھ کی لذت کے لیے گناہ کر رہے ہیں مگر کل وہی آنکھ ہمارے خلاف گواہی دے گی، ہاتھ سے پرایا مال چرایا، ہاتھ اس کی گواہی دیگا، غرض جسم کا ایک ایک عضو جسکی خواہش اور لذت کے لیے ہم گناہ کر رہے ہیں، ہمارے خلاف شہادت دے گا، اللہ تعالیٰ تو دیکھ ہی رہے ہیں، لیکن یہ ہاتھ پاؤں بھی تو ہمیں نہیں چھوڑتے، ان کو تو چھوڑ کر ہم عمل بھی نہیں کر سکتے، ہمارا ظاہر و باطن تمام اللہ تعالیٰ کی خفیہ پولیس ہے، اور کل وہ ہمارے مخالف گواہ ہوں گے، سو افسوس ہے اس احمق پر جو ان کو خوش کرنے کے لیے گناہ کرے اور وہ اس کے خلاف پھر گواہی دیں۔ اس لئے گناہوں سے بچنا چاہیے، اور اس عقیدہ کو حال بنانا چاہیے تاکہ گناہ سرزد نہ ہوسکیں۔"

اس تشریح سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی صرف ایک صفت بصیر کا عملی دھیان و مراقبہ اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور حال بن جائے تو تنہا یہ حال انسانی زندگی کو برائیوں سے روکنے کی کتنی عظیم تاثیر رکھتا ہے، یہی حال دوسری صفات الٰہیہ کا ہے۔ صفت بصیر کے متعلق چند اور فوائد لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے مراقبے کی بہت تاکید فرماتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا "ہر وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانیں۔"

ایک طالب کو ایک والا نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

آپ کو ان اوقات میں سے جو آپ کی تعلیم سے فارغ ہوں، تھوڑا وقت مقرر کرکے ہر روز

خواہ پندرہ ہی منٹ ہوں، آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو خدا کے سامنے حاضر سمجھکر گویا ہم دیکھ رہے ہیں، تصور کیجئے کہ ہم خدا کے سامنے ہیں۔"

دوسرے گرامی نامہ میں اسی کی مزید تشریح فرماتے ہیں:

"اس مراقبہ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا جو ایمان ہے وہ عملاً نمایاں ہو، اب آپ آگے بڑھیں، اب یہ کوشش کیجئے کہ نمازوں میں یہ خیال قائم ہو، کہ آپ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہیں، اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ نیت کرتے وقت دل میں یہ توجہ کیجئے کہ بندہ اب بارگاہ الٰہی میں حاضر ہے۔"

اسی طالب نے ایک مرتبہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ کی قربت، تو اس مراقبہ کی وجہ سے سانس سے بھی زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض کوتاہیاں ہوجاتی ہیں، تو تحریر فرمایا:

"جب انسان اللہ تعالیٰ کو ایسا حاضر و ناظر یقین کرتا ہے تو اس سے ضروری اعمال صالحہ کی بجاآوری میں سستی کیونکر ہوسکتی ہے، وہ جب یقین کرے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور ہم سے قریب ہیں تو اس کو شرمندہ ہونا چاہیے کہ اس حالت اور اس عنایت کے باوجود اعمال صالحہ میں کوتاہی کیوں ہو، اگر پھر بھی حالت نہ بدلے تو موت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہونا اور ایک ایک بات کا جواب دینا ہے۔ اس وقت بندہ اپنی کوتاہی کا کیا جواب دے گا اور پھر دنیا کی دولت و ثروت جس کی محبت میں انسان گرفتار ہے کیا کام آئے گی۔ اس وقت صرف اعمال صالحہ کام دیں گے، اس سے خدا کا خوف پیدا ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کو تحریر فرماتے ہیں:

"کسی وقت کو مقرر کرکے الم یعلم بان اللہ یریٰ کے مضمون کو سوچا کیجئے۔ اسی تفکر کا اصطلاحی نام مراقبہ ہے، اس تصور کا اثر اعمال پر پڑے گا، اور ہر عمل پر اس حیثیت سے زد پڑنے لگے گی کہ

سب کچھ اس کے سامنے ہے، اب حق و باطل، صحیح و غلط اور جائز و ناجائز پر غور کرنے کا رخ بدل جائیگا، اور ہر عمل کے وقت دل کو ٹٹولنے لگیں گے کہ میرے اس عمل کا قلبی مقصد کیا ہے، اس سے حسن نیت پیدا ہوگا، اور حدیث شریف کی یہ حکمت کھل جائے گی الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ۔ کیا یہ بدعت ہے؟ غور کیجئے، اور ہو سکے تو عمل کیجئے۔"

ایک طالب نے پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے اور ان کی ذات عالی پر یقین اور حسن ظن کی کیفیت میں کس طرح روز افزوں قوت بڑھے گی"۔ حضرت شیخ قدس سرہ نے جواب میں ارقام فرمایا: "اس طرح کہ آپ ہر روز کسی خاص سکون کے وقت میں تھوڑی دیر اس کا مراقبہ کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاظر و ناظر ہیں اور ہر وقت ہم کو دیکھ رہے ہیں۔"

کیفیت احسان و حضور | اللہ تبارک و تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے دائمی دھیان کا نتیجہ احسان و حضور کی وہ کیفیت بھی ہے جو خاصانِ الٰہی کا سرمایۂ تسکین ہے۔

قرب بے غیبت نماز عاشقاں — فی صلوٰۃٍ دائمونم آرزوست
خوش نمی آید سجود بے حضور — فی صلوٰۃٍ خاشعونم آرزوست
می برد بے تابیِ دل کو بکو — بر درت صبر و سکونم آرزوست
بسکہ دزدیدہ نگہ بر من فگن — نشترِ زخم دردنم آرزوست

حضرت شیخؒ ہی کا ایک اور شعر ہے

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی — آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جانانہ

جب اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا مراقبہ پختہ ہو جاتا ہے اور ذات باری تعالیٰ کا دھیان رسوخ حاصل کر لیتا ہے تو خود بخود حضور و احسان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور تحسین عمل کے

جذبہ سے اعمال میں حسن و خوبی اور صدق و کمال پیدا ہو جاتے ہیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالےٰ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

مرتبہ احسان | "مرتبہ احسان یہ ہے کہ اعمال اس طرح ادا ہوں جیسے مزدور مالک کے حضور میں کام کرتے ہیں۔" یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین اس طرح چھا جائے کہ گویا وہ بالکل سامنے ہیں اور ہمارے کام کو غور سے دیکھ رہے ہیں، کہ ہم اس کی بجا آوری میں کوتاہی تو نہیں کرتے، اس اذعان کا اثر یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے دھیان کی دولت نصیب ہوگی، دوسرے اعمال کو سنوار کر ادا کرنے کی کوشش کیجائے گی کہ مالک کے سامنے مزدور کام کو نہیں بگاڑا کرتا۔ اس لیے کیفیت احسان ایک نعمت ہے، حضرت شیخؒ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ کیفیتِ احسان گاہے گاہے بھی میسر آئے تو بہت ہے، اس پر شکر کیجئے، اور ترقی کی دعا مانگا کیجئے۔"

اسی طرح حضور کی کیفیت کا دوام بھی کم خوش قسمتوں کو نصیب ہوتا ہے، حضرت والاؒ نے ایک صاحب کو لکھا "جسقدر بھی حضور نصیب ہو وہ شکر کے قابل ہے، دوام حضور کم کسی کو نصیب ہوتا ہے۔"

لیکن اس کمی سے سالک کو ہمت پست نہ کرنا چاہیے اور استقامت سے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے، جو کچھ عطا ہو اس پر شکر ادا کرنا چاہیے، لیکن بعض بندگان خاص ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں قرب و حضور کی دائمی دولت نصیب ہوتی ہے، حضرت شیخؒ قدس سرہ ایک گرامی نامے میں کسی طالب کو ارقام فرماتے ہیں:

"دائم حضوری بھی انشاء اللہ تعالیٰ کبھی حاصل ہوگی لیکن اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہو جاتی ہے شکر کے قابل ہے، شکر سے نعمت کی زیادتی ہوتی ہے۔"

یہی احسان و حضور کی کیفیت راسخ ہو کر عارف کو قرب و معیتِ الٰہی کے دھیان سے

شادکام رکھتی ہے، اس کا دل مناجاتِ الٰہی میں مشغول اور کیفیاتِ سرمدی میں مخمور رہتا ہے، اور بس یہی دل چاہتا ہے کہ وہ

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

حضرت شیخ کا شعر ہے

کیا کیا نہ کہا تجھ سے پایا جو سراپا گوش
سجدہ میں جہاں سر ہے گویا کہ ترا در ہے

ایک سفر کے دوران میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت بیماری کی وجہ سے پژمردہ سی تھی، عصر کا وقت تھا، جس جگہ قیام تھا وہاں ملاقاتیوں کا ہجوم تھا، احقر نے حضرت کے آرام کے خیال سے عرض کیا، اگر خواہش ہو تو کچھ دیر باہر سیر کے لیے چلا جائے، طبیعت تازہ ہوا سے شگفتہ ہو جائیگی۔ اس کے جواب میں محبوب و دلکش تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ٔ در دل کشا بچمن درآ

حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے کہ "معیت اور قربِ تام کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی گود میں جا بیٹھتا ہے، بلکہ یہ ایک حال ہے جو اہلِ دل ہی جانتے ہیں"، اس مضمون کا حضرت کا ایک شعر بھی ہے۔

ادب سے دیکھ لیں مشتاق دور سے ان کو
مجال ہے جو انھیں کوئی ہمکنار کرے

حق بات تو یہ ہے کہ وجدانی کیفیات کے بیان کا قلم متحمل نہیں ہو سکتا اور یہ راستہ سراسر عمل کا ہے اور اعمال ہی کے ثمرات احوال و کیفیات ہیں۔

اخلاص | ہم اعمال کے مکلف ہیں، احوال و کیفیات مقصود نہیں، جب اخلاص کے ساتھ احسان و حضور کی کیفیت اعمال میں رچتی ہے تو جملہ اعمال زندہ، پرنور، با رونق اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہو جاتے ہیں، اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے جملہ اعمال ان صفات سے مزین ہوں"

حضرت شیخ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ اپنی توفیقات سے آپ کو بہرہ مند فرمائیں اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانیں' اور ہر کام اخلاص کے ترازو میں تول کر کریں۔ اخلاص کے معنی ہیں محض رضائے الٰہی کی طلب"۔

ایک دوسرے گرامی نامے میں ارشاد ہوتا ہے: "اخلاص کے بغیر تو اعمال مردہ ہیں، مگر اخلاص و ریا کی حقیقت سمجھ لیں، اخلاص نام ہے خالق کی رضا کے لیے کام کرنے کا اور ریا نام ہے مخلوق کی رضا کے لیے کام کرنے کا اب آپ اس روشنی میں اپنے اعمال پر نگاہ کریں"۔

طلب رضا اور اخلاص و ریا وغیرہ کے متعلق مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ارقام فرماتے ہیں:

"بالکل صحیح آپ سمجھے کہ طلب رضا اور ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے، اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو نسبت کہتے ہیں، اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبھم ویحبونہ اور رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کے لفظوں میں کی گئی ہے، یا ایھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ انہی کے لیے نوید بشارت ہے،

جزاک اللہ، خوب سمجھے، نام و نمود کی خواہش جس کا شرعی نام ریا و سُمعہ ہے، یہ حقیقت عمل کی مبطل ہے، الریاء ھو الشرک الخفی۔ کیونکہ اعمال خیر کی حقیقت ابتغاء مرضاۃ اللہ ہے اور جب اس میں شرکت ارضائے مخلوق اور طلب شہرت کی ہوگی تو شرک فی القصد ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً، اوکرماد اشتدت بہ الریح ہوگا، اس جذبۂ ریا و سمعہ کے قلع و قمع کے بغیر اخلاص فی الدین پیدا نہیں ہو سکتا، اور مخلصین لہ الدین کے سعادت مند گروہ میں داخلہ ممنوع ہوگا افرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ اسی ھوی کے روکنے کا نام صوفیوں کی زبان میں مجاہدہ ہے ونھی النفس کا اشارہ ادھر ہی ہے۔

اسی حقیقت کا اظہار حضرت نے اشعار میں بھی فرمایا ہے۔

ہر عبادت نذر تجانہ ہو ئی — دل میں گر مبھاہت خود کام ہے
علم و دولت جاہ و عزت ہیچ ہو — گر مجھے حاصل ترا انعام ہے
جب مرا مطلوب ہے تیری رضا — تب مجھے اوروں سے اب کیا کام ہے

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ریا دکھلاوے کے عمل کا نام ہے، ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ دکھلانے کے لیے عمل ریا بھی ہے اور شرک بھی، مگر کسی کے دیکھنے سے بچنے کے لیے نیک عمل کو ترک کرنا بھی ریا ہے کہ مخلوق کا خوف ترک عمل کا سبب بنا، اس لیے "غیر اللہ کے خاطر کسی نیک عمل کا ترک بھی ریا ہے، (میں نے شیخؒ کا مفہوم و منشا لکھا ہے) اور ریا کا یہ مادہ اس وقت تک نہیں جا سکتا، جب تک ما سوا سے تعلق اور اس کی محبت دل سے نہ نکل جائے، جب غیر کا دھیان جاتا رہے گا تو ریا و سمعہ کا جذبہ خود بخود ماند پڑ جائے گا، جب تک دوئی باقی ہے، دوسرے کا دھیان آہی جاتا ہے، کامل خلوص کامل فنا کے بغیر ممکن نہیں ہے، حضرت شیخؒ فرماتے ہیں:

سما جا مرے دل میں ارمان ہو کر — دوئی دور کر دے مری جان ہو کر
بتوں کا ہے بندہ خدا کا نہیں — خدا کا نہ ہو جو مسلمان ہو کر

(باقی)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج

میں

سواروں کا نظام

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے

(۴)

اورنگ زیب اور راجپوت سوار

شاہجہانی دربار میں راجپوتوں اور ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہجہاں کا بڑا لڑکا دارا شکوہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور مراسم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس کی تفصیل ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے، دارا اپنے مذہبی عقائد و رجحانات کی بنا پر ہندوؤں خصوصاً راجپوتوں میں بہت مقبول ہو گیا، اور جب تخت و تاج کے لیے شاہجہاں کے لڑکوں میں جنگ شروع ہوئی تو تمام اہم اور ممتاز راجپوت فوجی سردار دارا کی حمایت میں امنڈ پڑے، دھرماوت میں راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کو آگرہ کی طرف بڑھنے سے روکا، راجہ کے ساتھ بے شمار راجپوت سردار تھے، اورنگ زیب نے راجہ کو رقعہ بھی لکھا کہ بھائیوں کا خانگی معاملہ ہے، وہ بیچ میں نہ پڑے اور جنگ سے علحدہ ہو کر جودھپور جا کر آرام کرے، لیکن جسونت سنگھ کو اپنے خواب رنگیں کو حقیقت بنانا تھا، اس لیے وہ زمانہ اور دھرماوت کے میدان میں لڑائی شروع کر دی، اس نے اپنے ہراول میں دس ہزار سوار رکھے

جس میں زیادہ تر راجپوت تھے، ان کی نگرانی مکند سنگھ ہاڈا، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، امر سنگھ چند راوت، رتن راٹھور، ارجن گور، دیال داس جھالا، موہن سنگھ ہاڈا، اور دوسرے نامی سرداروں کے ذمہ تھی، التمش میں مہیش داس گور، گوردھن راٹھور اور دوسرے جانباز راجپوت تھے، قول میں خود راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راجپوت سواروں اور بھیم داس ولد راجہ منگل داس گور اور دوسرے سرداروں کے ساتھ تھا، میمنہ قول پر راجہ جے سنگھ سیسو دیہ اپنے بہادر راجپوت سواروں کے ہمراہ تھا،

لشکر کا کیمپ مالوجی، پرسوجی اور راجہ دیبی سنگھ کی نگرانی میں تھا،[1] کچھ مسلمان فوجی سردار بھی فوج میں تھے لیکن وہ انگشت بدنداں تھے کہ یہ دارا اور اورنگ زیب کی جنگ نہ تھی، بلکہ راجپوتوں اور اورنگ زیب کے اقتدار کی لڑائی تھی، جنگ شروع ہوئی، لیکن اورنگ زیب کی سپاہانہ ہوشمندی اور جنگی بصیرت کے سامنے راجہ جسونت سنگھ طفل مکتب ثابت ہوا، راجہ جسونت کے ہراول کے راجپوت سوار اورنگ زیب کے لشکر پر یلغار کرنے کا تہیہ کر ہی رہے تھے کہ اورنگ زیب کے برق اندازوں اور تیراندازوں نے گولوں اور تیروں کی اتنی بارش کی کہ راجپوت سوار بے لڑے گھوڑوں کی پیٹھ پر سے گرنے لگے، راجپوتوں نے یہ صورت دیکھی تو ان کے بہادر سرداروں میں مکند سنگھ ہاڈا، رتن راٹھور، دیال داس جھالا، ارجن گور، سجان سنگھ سیسودیہ وغیرہ "رام" "رام" کے نعرے لگاتے ہوئے اورنگ زیب کے توپخانے کی طرف بڑھے، اورنگ زیب کو راجپوت سواروں کی اس قومی خصوصیت کا احساس پوری طرح تھا کہ وہ مرنا جانتے ہیں، لیکن لڑنا نہیں جانتے، اس لیے ان سواروں کو اپنی توپوں کی طرف بڑھنے کا موقع دیدیا، اورنگ زیب کے توپچیوں نے ان کی یورش کو پہلے مضبوطی سے نہیں روکا، اور راجپوت سواروں کا دل بادل اور بھی آگے بڑھتا چلا آیا، اور جب ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں رہ گئی اس وقت توپچیوں نے ان پر ضربیں لگانی شروع کیں اور وہ کٹ کٹ کر گرنے لگے لیکن

[1] عالمگیر نامہ ص ۶۶ - ۶۱

بہادری کے جوش میں اورنگ زیب کے ہراول تک پہنچ گئے۔ اورنگ زیب کے سارے لشکری پوری تنظیم اور ترتیب کے ساتھ تھے، راجپوت سوار جب بہت آگے بڑھ گئے تو اورنگ زیب نے اپنے لشکر کا ایک دستہ بھیجکر ان کو ان کی فوجوں کے بقیہ حصے سے بالکل منقطع کر دیا، راجہ جسونت نے ان کی مدد کو کمک بھیجنا چاہا، لیکن راستہ مسدود تھا۔ اورنگ زیب نے قول سے بڑھکر اپنی فوج کی ایک اور دیوار حائل کر دی، پھر قول کے میمنہ اور میسرہ کی فوج نے بھی پیش قدمی کر کے راجپوت سواروں کو گھیر لیا جو اب موت کے منہ میں جا پڑے تھے، اور ان کے لیے ہلاکت کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا، ان کے خون سے ساری سرزمین لالہ زار ہو گئی، مکند سنگھ ہاڈا اور اس کے ہمراہی سردار ایک ایک کر کے ہلاک ہو گئے، اور جسونت سنگھ ان کی مدد کو کوئی کمک نہ بھیج سکا، راجپوتوں کو اس طرح لقمۂ اجل بنتا دیکھ کر دوسرے راجپوت سردار مثلاً رائے سنگھ سیسودیہ، سجان سنگھ بندیلہ اور امر سنگھ چند راوت وغیرہ پر سراسیمگی طاری ہوئی، اور انھوں نے میدان جنگ چھوڑ کر اپنے اپنے وطن کا رخ کیا، مگر قول میں راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راٹھور راجپوتوں کے ساتھ برابر لڑ رہا تھا لیکن مراد بخش نے اپنی سپہگری سے پہلے تو دیبی سنگھ بندیلہ کو پسپا کر دیا، پھر راجہ جسونت سنگھ کے قول کے بائیں بازو پر حملہ کر کے اس کے سواروں کو منتشر کر دیا، اسی اثنا میں اورنگ زیب نے سامنے سے، مراد نے بائیں طرف سے اور صف شکن نے دائیں جانب سے بڑھکر راجہ جسونت سنگھ، کے راٹھور سواروں کو اپنے حلقہ میں لے لیا لیکن اس کے ہمراہی سرداروں میں اسکرن، مہیش داس گور اور گوردھن نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس کو میدان جنگ سے باہر کر دیا، اور اس نے بہادر راجپوتوں کی لاشوں کا ایک انبار چھوڑ کر اپنے وطن جودھپور کی راہ لی،[1]

[1] عالمگیر نامہ ص ۷۵ - ۶۶ منتخب اللباب ج ۲ ص ۱۸ - ۱۷ - ۱۶

راجپوتوں کے تمام جانباز اور بہادر سردار دارا کی محبت میں ہلاک ہوگئے، اس کی
تخت نشینی میں راجپوتوں نے خواب کا ایک قلعہ تیار کر لیا تھا، لیکن دھرماوت کے میدان میں یہ خواب
خواب ہی رہا، جس سے تمام راجپوتوں کو انتہائی اذیت پہنچی، راجہ جسونت سنگھ جب اپنے وطن پہنچا
تو اس کی بیوی نے اس دکھ اور غم میں کہ وہ ایک اہم لڑائی ہار کر آیا ہے، اس کا منہ دیکھنا پسند نہ کیا۔
اس کے بعد سموگڑھ کے میدان میں دارا نے اورنگ زیب کے مقابلہ میں پھر ایک بار قسمت
آزمائی کی، اور راجپوتوں نے دارا کو تخت پر بٹھا کر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک
پہنچانے کی پھر کوشش کی، چنانچہ ان کے جتنے آزمودہ کار اور نامور فوجی سردار تھے مثلاً چھتر سال
ہاڈا، راجہ روپ سنگھ، بیرم دیو سیسودیہ، گردھر (راجہ بیٹھلداس کا بھائی)، بھیم (راجہ بیٹھل اس
کا لڑکا)، راجہ شیورام گور، رام سنگھ راٹھور، راجہ کشن سنگھ، پرتھی راج، مہا سنگھ بھدوریہ، رام سنگھ
اور کیرت سنگھ وغیرہ سب اکٹھے ہوئے[1] ان میں چھتر سال ہاڈا اپنی شجاعت اور نبرد آزمائی میں
تمام راجپوتوں میں ضرب المثل تھا، وہ پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑ چکا تھا، اس کو اپنی اور اپنے
سواروں کی جنگی کارگزاریوں پر بڑا ناز تھا، چنانچہ جنگ شروع ہوئی تو ہراول سے چھتر سال ہاڈا
اپنے سواروں کو لے کر صفوں کو چیرتا پھاڑتا مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچا، ان راجپوتوں میں راجہ
رام سنگھ راٹھور کو اپنی نبرد آزمائی کا بڑا پندار تھا، وہ زعفرانی رنگ کا لباس اور مروارید کا ہار
پہن کر اس نشہ میں مست آیا تھا کہ مراد اور اورنگ زیب کو شکست دے کر راجپوتوں کی شجاعت
کا سکہ جمائے گا۔ چنانچہ غیظ و غضب میں آگے بڑھتا ہوا مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچ گیا اور چلایا کہ
"تم دارا کے مقابلہ میں بادشاہی کی ہوس رکھتا ہے"، اور مراد پر برچھے کا وار کر کے مہاوت سے ہاتھی
بٹھانے کو کہا، لیکن مراد پر کسی قسم کا ہراس طاری نہ ہوا، اور راجہ رام سنگھ پر ایسا تیر مارا کہ وہیں ٹھنڈا

[1] عالمگیر نامہ ص ۹۶، ۵۰

ہو گیا، راجپوت سواروں نے اپنے ایک نامی سردار کو اس طرح ہلاک ہوتے ہوئے دیکھ کر پورا
جنگی زور صرف کر دیا، لیکن مراد ان سب پر غالب آیا، اور اس حملہ میں اتنے راجپوت کام آئے
کہ ساری زمین رنگین ہوگئی، اورنگ زیب قول سے مراد کی مدد کو پہنچنا چاہتا تھا کہ تمام راجپوت
اس کی طرف متوجہ ہو گئے، اور انھوں نے اورنگ زیب کو ہلاک کرنے میں جس طیش، تہور اور غیظ و
غضب کا اظہار کیا، وہ ہندوستان کی تاریخ میں یاد رہے گا، راجپوتوں نے پوری قوت کے ساتھ
اورنگ زیب پر حملہ کیا، راجہ روپ سنگھ تو جوش غضب میں گھوڑے کی پیٹھ سے اتر پڑا اور اورنگ زیب
کے ہاتھی کے پاس پہنچ کر ہودج کی ڈوری کاٹ کر اورنگ زیب کو زمین پر گرانا چاہا، جوہر شناس
اورنگ زیب اس کی اس جرأت اور جلادت سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے سپاہیوں کو اس کو
زندہ گرفتار کرنے کی ہدایت کی، لیکن اس کی قضا آچکی تھی، اس لیے اورنگ زیب کے ایک رکاب
نے اس کو لقمۂ اجل بنا دیا، اس کے بعد راجہ ستر سال ہاڈا آگے بڑھا، لیکن اورنگ زیب کی
جرأت اور پامردی کے سامنے اس کی بہادری بھی بیکار ثابت ہوئی، اور راجپوتوں کے تمام
نامور سردار مثلاً ستر سال ہاڈا، بھرت سنگھ، موکم سنگھ، رام سنگھ راٹھور، بھیم سنگھ گور، شیورام
گور وغیرہ ایک ایک کر کے مارے گئے،[1]

دھرماوت اور سموگڑھ کی لڑائیوں میں راجپوت جس طرح اورنگ زیب کی جان کے
گاہک بن کر لڑے، اس کی بنا پر راجپوتوں کے خلاف اورنگ زیب کے دل میں جتنا بھی میل
بیٹھتا کم تھا، لیکن اورنگ زیب کو ہندوستان جیسے بڑے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۲ پر ہے: "راؤ ستر سال و دیگر عمدہ ہائے راجپوتاں کہ در ازدحام [illegible] دیگر اعتضاد
استظہار اینہا بود و با اعتماد شہامت و پایداری ان ہلادت کیشان جہالت منش طریق فساد در راہ عناد
می پیمود ...... نیز دیکھو منتخب اللباب ج ۲ ص ۲۵ - ۲۶

حکومت کرتی تھی، اس لیے اس نے راجپوتوں سے اپنا دل صاف کرنے کی عملی کوشش کی، سموگڈھ کی لڑائی کے بعد راجہ جسونت سنگھ، راجہ جے سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اس کو جو کل تک اس کا سب سے بڑا دشمن تھا، معاف کرکے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، اور اسی زمانہ میں شہزادہ شجاع بنگال سے اپنی فوج لیکر آگرہ کی طرف کوچ کر رہا تھا، اورنگ زیب نے اپنے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کو ایک لشکر کے ساتھ شجاع کے مقابلہ کے لیے بھیجا، وہ کوڑا جہان آباد میں مقیم تھا کہ اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو راجپوتوں کے ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کی مدد کے لیے روانہ کیا، اس کے بعد خود بھی پہنچا اور جب کھجوہ میں جنگ شروع ہوئی، تو اورنگ زیب کے پاس نوے ہزار سوار تھے[1]، راجہ جسونت سنگھ کو دس ہزار راجپوت سواروں کے ساتھ برانغار میں متعین کیا گیا، دوسرے راجپوت سرداروں کے نام جو اس جنگ میں مختلف بازوؤں پر تھے، یہ ہیں:

مہیش داس راٹھور، بلوے چوہان، رام سنگھ، ہررام راٹھور، کشور سنگھ ہاڈا، سجان سنگھ، راجہ رائے سنگھ سیسودیہ، سبل سنگھ سیسودیہ، سندرداس سیسودیہ، راجہ چترمن جادون، کنور رام سنگھ ہاڈا، امر سنگھ ہاڈا، چندر راوت، جگت سنگھ ہاڈا، سورج مل کور، فتح سنگھ کچھواہہ، راجہ اندرمن دھندیرہ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راجہ پرم داس سیسودیہ، چتربھج، اندرمن بندیلہ، کشن سنگھ، چندراوت، بھگونت سنگھ ہاڈا، بھدوریہ، روپ سنگھ راٹھور، کیسری سنگھ بھورتیہ، رائے سنگھ راٹھور، رگھوناتھ سنگھ، موہکرن بندیلہ وغیرہ[2]،

[1] عالمگیر نامہ میں ان سواروں کا ذکر اس طرح ہے: "در آں روز از کثرت سپاہ وجوش لشکر آثار شور محشر ہویدا بود، و از غبار سم ستور و وفور مواکب منصور چہرۂ آسمان در روے زمین ناپید الشکری آراستہ و رنگین چوں خیل سبزہ و ریاحین توگفتی از زمین می جوشید و جیشے پر قہر و طیش، مانند امواج بحر مواج از شورش کین می خروشید زمین با ہمہ تحمل و سخت جانی از حمل گرانی آں خیل انبوہ ستوہ بود.... ج ۱ ص ۲۰۵ [2] عالمگیر نامہ ج ۱ ص ۴۹ - ۲۴۸

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دل سے دھرماوت اور سموگڈھ کی لڑائیوں کا اثر اور راجپوتوں سے غصہ اور عناد دل سے بالکل نکل گیا تھا، اور اس نے ان کو اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھ کر اور ان پر پورا بھروسہ کرکے لڑائی میں شریک کرلیا، کھجوہ کے میدان میں ایک رات پہلے فوجوں کی صف آرائی ہوگئی تھی، اور سواروں کو حکم دیدیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی مقررہ جگہوں سے نہ ہٹیں، اگر آرام کرنے کے لیے اپنے گھوڑوں سے اتریں بھی تو مسلح رہیں، تمام فوجی سردار صفوں کی ترتیب اور اس کا نظام درست کرنے میں رات بھر ادھر ادھر گشت کرتے رہے، اورنگ زیب ضروری ہدایتیں دے کر تہجد پڑھ رہا تھا کہ کیمپ میں یکایک شور ہوا اور فوج میں انتشار پھیل گیا، لشکریوں کو خیال ہوا کہ غنیم گھس آیا، لیکن پتہ چلا کہ جسونت سنگھ نے غداری کی، اور شجاع سے مل کر اپنے تمام راجپوت سواروں کے ساتھ شہزادہ سلطان کے کیمپ کو لوٹ رہا ہے، اس غارتگری اور لوٹ مار میں جو بھی حائل ہوا، راجپوتوں نے اس کو تہِ تیغ کردیا، اور کیمپ کا سارا سازوسامان مال واسباب اور مویشیوں کو لوٹ کر بالکل جھاڑو پھیر دی، اور کیمپ کے ایک اہم حصہ کو تباہ و برباد کرکے اپنے گھوڑوں کی باگ اپنے اپنے گھروں کی طرف موڑ دی، راجپوتوں کو یقین تھا کہ اس کے بعد اورنگ زیب کا شکست کھانا لازمی ہے، لیکن اورنگ زیب کا صبر، تحمل اور جنگی تدبر کام آیا، جسونت سنگھ کی غداری کی خبر اس کو مصلے پر ملی تھی، تہجد کی نماز اطمینان سے ختم کرنے کے بعد لشکر میں آکر لشکریوں کو ڈھارس دلائی کہ الحمد للہ اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہوگئی، اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں، اور واقعی تائید ایزدی اس کے ساتھ تھی، کیونکہ اس جنگ میں بھی وہ فاتح اور کامران رہا[1]، راجہ جسونت سنگھ کو اورنگ زیب کے کیمپ کی لوٹ میں جو دولت ملی اس سے راجپوتوں کی فوج تیار کرکے دارا کو اجمیر آنے کی دعوت دی، دارا شکست کھا کر ادھر ادھر

[1] عالمگیر نامہ ص ۵۷ - ۲۵۵ خافی خاں ج ۲ ص ۵۳

بھٹک رہا تھا، اس کو یاس و ناامیدی کے اس بادل میں جسونت سنگھ کی دعوت میں امید کی کرن نظر آئی، اور وہ ۲۲ ہزار سوار لے کر جسونت سنگھ کے پاس روانہ ہوا، اب اورنگ زیب کو جسونت سنگھ کی مفسدانہ کارروائیوں کے خلاف سخت اقدام کرنا پڑا، اس نے محمد امین خاں کی نگرانی میں دس ہزار کا ایک لشکر مرواڑ بھیجا، جب یہ لشکر مرواڑ کی سرحد میں پہنچا تو جسونت سنگھ منڈور سے بھاگ کر سیوانہ کے پہاڑی قلعہ میں چھپ گیا، اس وقت راجہ مان سنگھ کے پرپوتے مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ نے اس کو ایک دوستانہ خط لکھا کہ راجپوتوں کا خون بہانے سے کیا فائدہ، تم خود بھی برباد ہو جاؤ گے اور ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکتی رہے گی، اگر اب بھی تم اپنی روش سے باز آجاؤ تو اورنگ زیب سے تمھاری خطائیں معاف کرائی جا سکتی ہیں[1]، جسونت سنگھ کی عقل میں بھی بات آگئی، اس لیے وہ دارا شکوہ کی مدد سے باز آگیا، اس سلسلہ میں جدوناتھ سرکار نے راجہ جسونت سنگھ کے بارہ میں لکھا ہے کہ

"ایک اعلیٰ منصب اور اعلیٰ شہرت کے راجپوت نے اپنے وعدے کا ایفا نہیں کیا، اس جنگ جانشینی میں شریک ہونے والے تمام افراد میں جسونت سنگھ کی سیرت بہت ہی بری ہے، وہ ایسی لڑائی میں میدان چھوڑ کر بھاگا جب وہ سردار تھا، اور غداری کر کے ایک دوست کے کیمپ پر حملہ کیا اور پھر اپنے حلیف کو چھوڑ کر اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا، خصوصاً جب اس کو خطرے میں لے آیا تھا، وہ آدمی بہت ہی بدنصیب تھا جس نے مرواڑ کے راجہ اور راٹھور راجپوتوں کے سردار مہاراجہ جسونت سنگھ پر بھروسہ کیا"[2]

لیکن اورنگ زیب آخر وقت تک راجہ جسونت سنگھ پر اعتماد کرتا رہا، دارا کی موت کے بعد جسونت سنگھ کو اس کے ضمیر نے کوئی ملامت نہیں کی، اور وہ بلا تکلف اورنگ زیب کے دربار میں

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۳۰۰ [2] اورنگ زیب از جدوناتھ سرکار جلد ۲ ص ۱۷۰

حاضر ہو گیا، اور اورنگ زیب نے بھی اس کی تمام خطاؤں سے چشم پوشی کی، اور اس کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن راجہ جسونت کے دل میں اپنے فراخ دل آقا کے لیے کبھی کوئی نرمی اور محبت پیدا نہیں ہوئی اس لیے جب ۵ سنہ جلوس سیواجی کے خلاف ایک مہم پر بھیجا گیا تو پھر غداری کا ثبوت دیا، اورنگزیب نے آزردہ ہو کر اس کی جگہ پر مرزا راجہ جے سنگھ کو مامور کیا، اس مہم میں راجہ جسونت سنگھ کا سالا راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا بھی اس کے ساتھ تھا، جسونت سنگھ نے اس کو بھی اورنگ زیب کے خلاف سازش میں شریک کرنا چاہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا، تو جسونت سنگھ نے اپنی بیوی (یعنی راؤ بھاؤ سنگھ کی بہن) کو ملا کر اس پر دباؤ ڈالنا چاہا، لیکن راؤ بھاؤ سنگھ نے اپنے دامن پر نمک حرامی کا داغ لگنے نہ دیا[1]،

مگر اس کے بعد بھی جسونت سنگھ اورنگ زیب کی نظروں سے نہیں گرا، ۹ سنہ جلوس میں وہ شاہزادہ معظم کے ساتھ کابل بھیجا گیا، اور ۱۰ سنہ جلوس میں دکن کی مہم میں تعینات کیا گیا، اور ۱۴ سنہ جلوس میں جمرود (مضافات کابل) کی حکومت پر سرفراز کیا گیا، اور یہیں وہ مرا[2]

راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کے ساتھ اپنی معاندانہ اور مخالفانہ روش کی جو آنکھ مچولی کھیلی اور اورنگ زیب نے رواداری اور عفو و درگذر کا جو نمونہ پیش کیا، اس کی مثال کم ملے گی، لیکن جسونت سنگھ کی روح موت کے بعد بھی اورنگ زیب کے سر پر منڈلاتی رہی، اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی، اس لیے اورنگ زیب نے راجہ جسونت سنگھ کے بھتیجے راجہ اندر سنگھ کو مرواڑ کا رانا بنایا، لیکن جیسا کہ ایسر داس نے فتوحات عالمگیری میں لکھا ہے کہ مرواڑ کے راجپوت فساد برپا کرنے کے لیے تلے ہوئے تھے، اس لیے راجہ جسونت سنگھ کی موت کے بعد راٹھور راجپوتوں نے خبر دی کہ راجہ کی دو رانیاں حاملہ ہیں، پھر دو بچوں کی ولادت کا بھی اعلان کیا، گر اورنگ زیب جانتا تھا کہ یہ بچے فرضی ہیں[3]، پھر بھی ان کو اپنی تولیت میں لینا چاہتا تھا لیکن راٹھور راجپوت راضی

---

[1] ماثر الامراء ج ۲ ص ۶۰۰ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۰۰ [3] جدوناتھ سرکار نے ان بچوں کے فرضی ہونے اور نہ ہونے پر اپنی کتاب اورنگ زیب ج ۳ ص ۱۵۰ پر بحث بھی کی ہے۔

نہ ہوئے، اور اودے پور کے مہارانا نے بھی ان کی حمایت میں باغیانہ فضا پیدا کر دی، اس لیے اورنگزیب کو مجبوراً ان کے خلاف لشکر کشی کرنا پڑی، اس فوج کشی میں شہزادہ اکبر کے ساتھ بڑا راجپوت سرداروں کے علاوہ خود راٹھور راجپوت سردار بھی شریک تھے، جس کو جدوناتھ سرکار نے بھی تسلیم کیا ہے[1]، اس مہم میں راجپوتوں نے شہزادہ اکبر کو سبز باغ دکھا کر اورنگ زیب سے توڑ لیا لیکن اورنگ زیب کا تدبر اس موقع پر بھی کام آیا، اور راجپوتوں کو پسپا ہونا پڑا، بیکانیر کے راجہ شیام سنگھ نے بیچ بچاؤ کیا، اور اودے پور کے رانا جے سنگھ کو شہزادہ محمد اعظم کی خدمت میں لاکر حاضر کیا، جب شہزادہ رانا کو لے کر اورنگ زیب کے پاس پہنچا تو اورنگ زیب نے اس کو امتیازی جگہ پر بٹھایا، اور خلعت، شمشیر مرصع، جمدھر، پھول کٹارہ، گھوڑا مع ساز طلا، ہاتھی مع ساز نقرہ عطا کر کے پنج ہزاری پنج ہزار سوار کے اعزاز سے نوازا، اور اس کے ساتھیوں کو بھی طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز کیا[2]۔

مہارانا جے سنگھ کے دو بھائی راجہ بھیم سنگھ اور راجہ اندر سنگھ بھی اورنگ زیب کے دامنِ دولت سے آخر وقت تک وابستہ رہے، ۳۳ سال جلوس میں بھیم سنگھ پنجہزاری منصب پر پہنچکر مرا، اندر سنگھ ۴۸ سال جلوس میں سہ ہزاری منصب پر فائز ہوا،

جودھپور اور جے پور کے راجپوتوں نے جسونت سنگھ کے فرضی لڑکے اجیت سنگھ کے لیے تو شورش بپا کی، لیکن جب اودے پور کے رانا نے اورنگ زیب سے صلح کر لی تو پھر اس کو جنگلوں اور پہاڑوں میں آوارہ گرد ہونے کے لیے چھوڑ دیا، وہ ایک عرصۂ دراز تک غارتگری اور خونریزی کرتا رہا، عالمگیر کے بعد جب وہ بہادر شاہ کے دربار میں نادم ہو کر پہنچا، تو بہادر شاہ نے اس کو سہ ہزاری منصب سے نوازا، لیکن وہ اپنی مفسدانہ سرشت سے باز نہیں آیا، اور ایک لاابالی زندگی بسر کرنے کے بعد فرخ سیر

[1] اورنگ زیب جلد ۳ از جدوناتھ سرکار ص ۴۴۱ [2] مآثر عالمگیری ص ۲۰۸

کے عہد میں اپنی لڑکی کا ڈولہ اس کے پاس بھیج کر پھر شاہی نوازشوں کا خواستگار ہوا، ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ کو نہایت دھوم دھام سے یہ شادی انجام پائی، یہ آخری راجپوت لڑکی تھی جو مغل حرم میں داخل ہوئی،

یہ لکھکر صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ راجپوتوں کے تعلقات مغل دربار سے آخر آخر وقت تک بہت زیادہ کشیدہ نہ رہے تھے، جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے راجپوتوں کو اپنی روش سے حکومت سے بالکل دور کر دیا تھا، یہ اور دوسری مثالوں سے بھی ثابت ہوگا۔

اجیت سنگھ کی جانشینی کا فتنہ و فساد برپا کرنے میں درگاداس راٹھور کا بڑا حصہ رہا، وہ راجہ جسونت سنگھ کے وزیر اسکرن کا لڑکا تھا، اسی نے سازش کر کے شہزادہ اکبر کو اورنگ زیب سے توڑا، اور شہزادہ اکبر کے نوزائیدہ بچے بلند اختر کو ایک عرصہ تک اپنے قبضہ میں کیے رہا، تاکہ اورنگ زیب سے بڑی سے بڑی رعایتیں حاصل کرے، وہ ۴۲ سال جلوس میں نادم ہو کر شجاعت خان ناظم احمد آباد کے توسل سے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوا، یہ گویا اس کا اعتراف جرم تھا، لیکن اورنگ زیب سے اس کی یہ اہانت دیکھی نہ گئی، اور اس نے اس کے ہاتھ کھلوا دیے، اور خلعت اور جمدھر مرصع عطا کر کے منصب سہ ہزاری دو ہزار دو پانصد سوار سے بھی نوازا[1]،

راٹھور راجپوتوں کے لیے اورنگ زیب کا دل بڑا ہی نرم اور گداز تھا، راجہ جسونت سنگھ کا خسر پریم دیو سسودیہ سموگڈھ کی لڑائی میں اورنگ زیب کے خلاف تھا، لیکن جب اورنگزیب سے آکر ملا تو اس نے اس کا پورا اعزاز و اکرام بدستور سابق قائم رکھا، اور برابر خلعت فاخرہ اور شاہی الطاف سے نوازتا رہا، وہ دکن میں متعین تھا، پھر راجہ رام سنگھ کچھواہہ کے ساتھ آسام کی مہم پر بھیجا گیا، ۱۲ سال جلوس میں متھرا کا فوجدار مقرر ہوا، اور یہیں انتقال کیا[2]،

بیان کیا جا چکا ہے کہ سموگڈھ میں راجہ روپ سنگھ راٹھور نے اپنی جان کی بازی لگا کر اورنگزیب

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۹۵ [2] عالمگیر نامہ ص ۲۱۳، ۲۲۵، ۲۳۷، ۲۶۲، ۱۰۳۶ و مآثر عالمگیری ص ۸۴

کی جان لینے کی کوشش کی تھی، گو وہ خود ہلاک ہوا، مگر اورنگ زیب کو افسوس رہا کہ ایسا پر جوش اور جری راجپوت سردار مارا گیا، لیکن جب اس کا لڑکا مان سنگھ عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوا تو اسکو بے شمار شاہی عنایتوں سے نوازا، اور ہزار و پانصدی و ہفت عد سوار کا منصب عطا کیا،[1] اور پھر ترقی کر کے سہ ہزاری منصب پر فائز ہوا، راجہ روپ سنگھ، مہاراجہ جسونت سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا، یہ خاندان عالمگیر سے اور زیادہ قریب تر ہو گیا، جب چوتھے سال جلوس میں راجہ روپ سنگھ کی ایک لڑکی شہزادہ محمد معظم سے بیاہی گئی، اور یہ شادی نہایت تزک و احتشام اور دھوم دھام سے انجام پائی جس کی پوری تفصیل عالمگیر نامہ (ص ۴۴۴ - ۶۳۹) میں درج ہے، شہزادہ محمد کام بخش کی شادی بھی ایک راجپوت خاندان میں ہوئی، یہ شہزادی منوہر پور کے راجہ امر چند کی بیٹی اور جگت سنگھ کی بہن تھی، یہ شادی عالمگیر کے چوبیسویں سال جلوس میں ہوئی،[2]

یہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ راجہ چھتر سال ہاڈا دارا شکوہ کی معیت میں سموگڈھ کی لڑائی میں اس جذبہ کے ساتھ شریک ہوا تھا کہ اس کے نیزہ کی انی پر اورنگ زیب کا سر ہوگا، لیکن وہ خود مارا گیا، اور جب اس کا لڑکا بھاؤ سنگھ ہاڈا اورنگ زیب کے پہلے سال جلوس میں دربار میں حاضر ہوا تو اورنگ زیب نے اس کو علم و نقارہ اور خطاب راؤ کے ساتھ سہ ہزاری ذات دو ہزاری سوار کا منصب عطا کیا، اور علاقہ بوندی جاگیر میں دیا، وہ اورنگ زیب کے ساتھ شجاع کی لڑائی میں شریک رہا، پھر دکن میں متعین ہوا، ۳ھ جلوس میں چاکنہ کی مہم میں جانبازی سے لڑا، راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ شیواجی کے خلاف بھی معرکہ آرا ہوا، ۹ھ میں چاندہ کے زمیندار کی تادیب کے لیے بھی گیا، اس کے بعد اورنگ آباد میں مامور ہوا، اور وہیں اورنگزیب نے ۱۰ ویں سال جلوس میں وفات پائی،[3]

۱ مآثر عالمگیری ص ۴۴ ۲ ایضاً ص ۲۱۱ ۳ مآثر الامراء ج ۲ ص ۳۰۵

مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ بھی شروع میں دارا شکوہ کا حلیف رہا، لیکن جب اورنگ زیب سے آ کر ملا تو اس نے بڑے احترام سے اس کا خیر مقدم کیا، اور ایک کروڑ دام کی مالگذاری کا محال عطا کیا، سنہ جلوس میں سیواجی کے خلاف مہم پر بھیجا گیا، تو چودہ ہزار سوار اس کے ساتھ گئے اور دوسرے فوجی فوجی سردار دلیر خاں، داؤد خاں، احتشام خاں اور زبردست خاں اس کے ماتحت بنائے گئے، راجہ جے سنگھ کے ساتھ اور بھی راجپوت سوار تھے، ان میں سے بعض کے نام ہیں، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، راجہ رائے سنگھ سسودیہ، پورن مل، کیرت سنگھ، اس مہم میں راجہ جے سنگھ نے جو خدمت انجام دی اس کے صلہ میں اسکو اسکے منصب میں دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کی ترقی دے کر منصب ہفت ہزاری ذات ہفت ہزار سوار دو اسپہ پر مامور کیا گیا،[2] شہ جلوس میں راجہ بیجاپور کی مہم میں روانہ کیا گیا اور واپسی میں اورنگ آباد پہنچکر ۱۰۷۷ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، اورنگ زیب کو اسکی موت کی خبر ملی تو اس کو بڑا رنج ہوا، وہ اس کے حسن تدبیر، سنجیدگی فکر، سپہگری اور فوجی قیادت کا بڑا مداح تھا، مسلمان مورخین نے بھی اس کے اوصاف کی تعریف کی ہے، مآثر الامراء میں ہے کہ

"با مزاج زمانہ شناسا و باندیشہ و وقت آشنا فراہم داشت، ازیں جاست کہ از ابتداے دولت تا انتہاے زندگی بآبرو بسر بردہ۔" (ج ۳ ص ۵۷۷)

اس کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اس کے بیٹے کنور رام سنگھ کو راجہ کے خطاب اور دوسری شاہانہ عنایتوں سے نوازا، گو یہ بھی سموگڈھ میں دارا شکوہ کے ساتھ تھا، لیکن جب باپ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا تو خلعت و انعام سے سرفراز کیا گیا، راجہ جے سنگھ جب سیواجی کو عالمگیر کے دربار میں لایا تو اس کی قیام گاہ کی نگرانی رام سنگھ ہی کے ذمہ کی گئی، لیکن اسکی چشم پوشی کی وجہ سے شیواجی آگرہ سے فرار ہو گیا، جس سے اورنگ زیب کو بڑا دکھ پہنچا اور اس کو منصب سے

۱ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۱۷۸، ۲ مآثر عالمگیری ص ۵۱

معطل کر کے دربار میں آنے کی ممانعت کر دی، لیکن راجہ جے سنگھ کی موت پر اورنگ زیب نے رام سنگھ کا قصور معاف کر دیا، اور دربار میں بلا کر اس کو راجہ کا خطاب عطا کرتے وقت خلعت مع جمدھر مرصع شمشیر مع ساز مرصع اسپ عربی مع ساز طلا، فیل مع جل زربفت وساز نقرہ مرحمت کیا، اور چار ہزاری ذات چہار ہزار سوار کے منصب سے سرفراز کیا، اور اس کے باپ کی کل جاگیر بھی دیدی، وہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے پنجہزاری ذات پنجہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ تک پہنچا[1]، راجہ جے سنگھ کا چھوٹا بیٹا کیرت سنگھ بھی اورنگ زیب کے ساتھ اپنی زندگی کے آخر تک وابستہ رہا، وہ سہ ہزاری ذات دو ہزار پانصد سوار کے منصب تک پہنچکر ۱۰۸۰ھ میں دکن میں مرگیا،

جے سنگھ کے پرپوتے بجے سنگھ کو ترقی وعروج کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں اورنگ زیب ہی کا ہاتھ ہے، وہ راجہ بشن کا بیٹا تھا، ۴۴ سنہ سال جلوس میں اورنگ زیب نے اسکو اپنے سایہ عاطفت میں لیا، او ہزار پانصدی ذات ہزار سوار کا منصب دے کر راجہ جے سنگھ کے خطاب سے نوازا اور وہ دھیراج راجہ جے سنگھ سوائی کے لقب سے تیموری بادشاہوں کے آخری دور میں نہایت ممتاز اور اہم ارکان سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا، ۴۵ سنہ سال جلوس میں اورنگ زیب نے اسکو عمدۃ الملک اسد خاں کے ساتھ قلعہ کھیلنا کی تسخیر کے لیے بھیجا، تو اس نے اورنگ زیب کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی نوجوانی میں بڑی جانبازی اور دلیری کا ثبوت دیا، اور قلعہ فتح ہونے کے بعد اورنگزیب نے اس کی کارگذاری کے صلہ میں اس کے منصب میں اضافہ کیا اور پھر وہ برابر ترقی کرتا گیا[2]۔

عالمگیر کے چھوٹے چھوٹے راجپوت فوجی منصبداروں کی بڑی لمبی فہرست ہے، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

راجہ اودت سنگھ (زمیندار اوندچہ، دو ہزاری پانصدی ہزار پانصد سوار) راجہ دیبی سنگھ

---

[1] ماثر الامراء ج ۲ ص ۳۰۱ - ۳۰۳ [2] ایضاً ص ۸۱ خافی خان ص ۴۹۹

بندیلہ (دو ہزار پانصدی و پانصد سوار) بکرم سنگھ گوالیاری (دو ہزاری پانصد سوار) رام چند سنگھ (سہ ہزاری) باسدیو سنگھ (جندن گرا کا زمیندار، سہ ہزاری) سو بھکرن بندیلہ دو ہزاری ہزار صد سوار بشن سنگھ (ہزاری و چار صد سوار) سروپ سنگھ (یکہزاری) رگھناتھ سنگھ راٹھور (ہزار و پانصدی شش صد سوار) راجہ کلیان سنگھ (بھداور کا زمیندار ہفتصدی) وغیرہ[1]،

اورنگ زیب راجپوتوں کو ہمیشہ حکومت اور فوج کا ضروری جزو سمجھتا رہا، اور اپنے مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں راجپوت سرداروں کی نگرانی میں لشکر بھیجنے میں بالکل تامل نہ کرتا تھا، ماثر عالمگیری میں ہے:

"عادل خاں بیجاپوری پیش کش ادا کرنے میں سستی سے کام لیتا تھا، اور سیواجی کو مدد دینے میں کوشش کرتا تھا، ایک فرمان راجہ جے سنگھ کے نام صادر ہوا کہ سیوا کے مقبوضات اور قلعوں کا بخوبی انتظام کر کے فوراً بیجاپور پر دھاوا کرد، قلعہ کے محاصرہ میں ایام گزاری سے پرہیز کر کے جلد از جلد لشکر مخالف کو تباہ اور برباد کرد[2]"

اور خود راجپوتوں کو بھی اورنگ زیب کی حمایت میں ہندوؤں کے خلاف معرکہ آرا ہونے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، آسام والوں نے ۱۰ سنہ سال جلوس میں بغاوت کی، تو اس کی سرکوبی کے لیے راجہ رام سنگھ کو بھیجا گیا، اور اس کے ساتھ دوسرے راجپوت سردار کبیر سنگھ بھبورتیہ، رگھناتھ سنگھ اور بیرم دیو سنگھ سسودیہ بھی تھے، جن کے ماتحت راجپوت اور مسلمان سوار دونوں تھے، اور یہ بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ راجپوت اپنی کارگذاری کے صلہ میں عالمگیر کے آخر وقت تک شاہی انعام واکرام سے سرفراز ہوتے رہے، چنانچہ ۴۳ سنہ سال جلوس کے ذکر میں ماثر عالمگیری میں ہے:

---

[1] عالمگیرنامہ کے شروع میں جو انڈکس ہے، اس سے بھی عالمگیر کے راجپوت وابستگان دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، [2] ماثر عالمگیری ص ۱۰۱ [3] عالمگیر نامہ

"اودے سنگھ قلعہ دار سنہر لنا سہ ہزاری دو صد سوار کا امیر تھا، اسے اضافہ مشروط

دبا شرط پانصدی سی صد سوار عطا ہوا"

درگا داس راٹھور کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ عالمگیر کی شاہی ملازمت چھوڑ کر علیحدہ ہوگیا تھا، لیکن سنہ ۴۹ سال جلوس میں اس کے دربار میں آیا تو اس کو پھر سہ ہزاری دو ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا،

سنہ ۴۹ سال جلوس میں اورنگ زیب کی فوج نے جنجی کے مرہٹہ راجہ رام کے خلاف فوجکشی کی تو اس مہم میں راجپوت سردار بھی سرفروشی اور جانبازی سے لڑے، راؤ دلپت رائے بندیلہ ایک لشکر جرار کے ساتھ اس معرکہ میں شریک تھا، مآثر عالمگیری میں ہے کہ اس معرکہ میں راؤ دلپت رائے کے اکثر ہمراہیوں نے بہادرانہ جنگ کے بعد اپنی جان دی، اور زخمی ہوئے، پھر اسی معرکہ میں رام سنگھ ہاڈا راج گڈھ کے قلعہ کے اوپر جس جرأت کے ساتھ چڑھا ہے، وہ ایک اہم کارنامہ ہے، فتح کے بعد اورنگ زیب نے راؤ دلپت رائے بندیلہ اور رام سنگھ بندیلہ دونوں کو بطور انعام مناصب عطا کیے،[1]

راجپوتوں نے مرہٹوں کے خلاف بھی اورنگ زیب کی حمایت میں جنگ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ سیواجی کے خلاف راجہ جے سنگھ نے راجپوت سرداروں اور سواروں کے ساتھ قیادت کی تھی، خود مرہٹے بھی اورنگ زیب کی حکومت اور فوج کے معزز سردار رہے، سیواجی کا داماد اچلاجی سیواجی سے ٹوٹ کر اورنگ زیب کا حامی اور طرفدار بن گیا تھا، وہ سنہ ۲۹ سال جلوس میں پنجہزاری منصب پر فائز تھا، سیواجی کے لڑکے سنبھاجی کا نوکر مانکوجی بھی اورنگ زیب سے مل گیا تھا، اور سنہ ۳۱ سال جلوس میں منصب دوہزاری سے سرفراز کیا گیا، سیواجی کا بھتیجا ادجوجی بھی اورنگ زیب کے دامن دولت سے وابستہ ہوا، اور کانھوجی سرکیہ تو اورنگ زیب کے آخری سال حکومت میں

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۰۵

شش ہزاری منصبدار ہو کر اس کے دربار کا معزز امیر اور فوجی سردار ہوا،

یہ مضمون طویل ہو رہا ہے، اس لیے مرہٹے سواروں نے اورنگزیب کی فوج میں جو قابل قدر خدمت انجام دی، اس کو سردست قلم انداز کیا جاتا ہے، لیکن اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے اسکا ذکر بھی ضروری ہے کہ سواروں کے لیے جو گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے، ان کی افزائش نسل اور دیکھ بھال کیلیے کیا کیا اہتمام ہوتا تھا،

عام طور سے چھ قسم کے گھوڑے فوج میں استعمال کیے جاتے (۱) عراقی (۲) ترکی (۳) یابو (۴) تازی (۵) جنگلہ (۶) مجنس، ان میں یابو کابل سے آتے تھے، تازی اور جنگلہ ہندوستانی نسل کے گھوڑے تھے، مجنس شاید ایرانی نسل کے گھوڑے ہوتے تھے، اکبر نے عراقی اور ترکی گھوڑوں کی نسل ہندوستان میں بڑھانے کے لیے پوری کوشش کی، اور جہانگیر کے بیان کے مطابق اس کو اس میں کامیابی ہوئی، اور عراقی اور ترکی گھوڑوں کی نسل ہندوستان میں خاطر خواہ طریقہ پر بڑھی،[1]

ہر منصبدار کو اپنے منصب کے لحاظ سے ہر قسم کے گھوڑوں کی ایک مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی، مثلاً دہ ہزاری منصب دار کو کم از کم ۶۸ عراقی، ۶۸ مجنس، ۱۳۶ ترکی، ۱۳۶ یابو اور ۱۳۶ جنگلہ رکھنا پڑتا تھا، اس طرح دوبیستی کو ایک عراقی، دو مجنس، دو ترکی، ایک تازی اور ایک یابو رکھنا ہوتا تھا،[2]

جنگی گھوڑے پورے اہتمام کے ساتھ آراستہ پیراستہ کیے جاتے، ان کے مختلف ساز و سامان کے نام یہ ہیں: زین، ازتنگ، ازتنگ گجم، تجمعہ بند، دپائے بند، اورنگ جبیت، پنبہ، یال پوش، جل، رومال پشمین، مگس ران، پشت تنگ، خرخرہ، قیزہ، نکتہ، قشقہ، گردنی، نشل وغیرہ[3]

گھوڑے کی خوراک کے لیے حسب ذیل ظروف تھے:

توبرہ، سبد، کراہ، سبد، متین سطل[4]، ان سب کی تصویریں آئین اکبری میں دی ہوئی ہیں، جن کو دیکھ کر ان کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے،

[1] تزک جہانگیری ص ۳۰۱ [2] تفصیل کے لیے دیکھو آئین اکبری ص ۱۴۱-۱۴۴ [3] آئین اکبری ص ۹۶، ۹۷ [4] ایضاً ص ۹۷

گھوڑوں کی تربیت، نگہداشت اور خدمت کے لیے مختلف ملازم مقرر تھے جنکے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) آختہ بیگی - گھوڑوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، اس عہدہ پر کوئی ممتاز منصب دار مقرر کیا جاتا تھا، وہ گھوڑوں اور ان سے متعلق تمام ملازمین کی عام دیکھ بھال کیا کرتا تھا،

(۲) داروغہ - شاہی اصطبل کا نگراں ہوتا تھا، پنجہزاری منصب تک کے امراء اس عہدہ پر فائز کیے جاتے،

(۳) مشرف - گھوڑوں کے اعداد و شمار، خرید و فروخت اور ان سے متعلق تمام باتوں کا ذمہ دار ہوتا، یہ عہدہ بھی کسی معزز امیر ہی کو دیا جاتا تھا،

(۴) دیدہ ور - شاہی معائنہ سے قبل گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اسکی تفصیل مشرف کو قلمبند کراتا،

(۵) اتنجی - سفر میں گھوڑوں کا محافظ ہوتا، اور ان کو وہی آراستہ پیراستہ کرتا تھا،

(۶) چابک سوار - گھوڑوں کی تیز رفتاری کا اندازہ لگانے والا ہوتا تھا،

(۷) ناڈا - گھوڑے کو شاید پھیرتا تھا، اور ان کو کچھ طور طریقے بتاتا تھا، اس کام کے لیے عموماً راجپوت ہی مقرر کیے جاتے تھے،

(۸) نیردہہ - دس سائیسوں کا سردار ہوتا تھا،

(۹) بیطار - یہ گھوڑوں کے امراض کا معالج ہوتا تھا،

(۱۰) نقیب - ہر طویلہ کی کیفیت داروغہ اور مشرف کے پاس پہنچاتا تھا،

(۱۱) زین دار - یہ شاید گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے،

(۱۲) آب کش - چالیس گھوڑوں کے لیے تین آب کش اور بیس کے لیے دو آب کش ہوا کرتے تھے،

(۱۳) سائیس - دو گھوڑوں کی خدمت کے لیے ایک سائیس مقرر کیا جاتا تھا،

ان کے علاوہ، فراش، سپند سوز، خاکروب اور نعل بند ہوا کرتے تھے،

فن سباق پر ایک سرسری نظر

از جناب سید امین الحسینی صاحب، حیدر آباد

یہ مضمون عام اعتبار سے جس قدر خشک اور غیر دلچسپ ہے، اس قدر فنی لحاظ سے اوق و اہم ہے، اور اس کے مطالعہ بغیر عہد ماضی کی دستاویزات عام ازیں کہ وہ سلاطین مغلیہ سے متعلق ہوں یا قطب شاہیہ یا عادل شاہیہ یا آصفیہ وغیرہ سے، معمہ بن کر رہ جاتی ہیں،

سباق کے لغوی معنی "راندن" یعنی ہانکنا، اور "پائے بند باز" یعنی باز کو باندھنے کی زنجیر کے ہیں، اور سباق کے حقیقی معنی جو اصحاب اللغات نے بتائے ہیں اس کی دو توجیہیں بیان کی ہیں، اول یہ کہ چونکہ حساب نویسی کے وقت زبان کی حرکت کے ساتھ ساتھ قلم کو بھی حرکت دینی پڑتی ہے، اس لیے "راندن" کہا گیا، اور دوسری یہ کہ چونکہ حساب کے لیے حساب کے قواعد کا دماغ میں محفوظ رکھنا ضروری ہے، لیکن حسابی طور و طریق دماغ سے عموماً ایسے محو ہو جاتے ہیں جس طرح باز ہاتھ پر سے اڑ جاتا ہے، اس لیے ان حسابی قواعد و ضوابط کو ضبط تحریر میں لاکر "پائے بند باز" کی طرح جکڑ دیا جاتا ہے تاکہ جب کہیں ان ضوابط کو دیکھنے کی ضرورت لاحق ہو فوراً ان سے استفادہ کیا جا سکے، بہرحال اس پوری عبارت کا ماحصل یا سباق کے اصطلاحی معنی یہ ہوئے کہ سباق "ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ ہمیں حساب نویسی کے اصول و قوانین معلوم ہوتے ہیں"

اس کا موضوع یعنی جس سے بحث کی جاتی ہے "مد و رقم" ہے، اور اس کا واضع راجہ ٹوڈرمل ہے۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس فن میں "مد و رقم" کے علاوہ ان خاص خاص کاغذات سے بھی

بحث کی جاتی ہے جس کا تعلق نظم ونسق سلطنت سے ہے، نیز یہ کہ مملکت کے خاص خاص عہدہ داروں سے کیا خاص فرائض مختص تھے، فوج بندی کے کیا اصول تھے، کسی نو وارد سپاہی کے چہرے، اسکے جانور یا ہتھیار یا منصبدار اعلیٰ کے میانے، پالکی کے چہروں کی ترتیب کے لیے کون سے خاص امور ملحوظ رکھے جاتے تھے، اس طرح ترکی سال جو عموماً عطاء آراضی کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اوزان و پیمانہ جات و علامات خاص اور الفاظ تمیز وغیرہ اس فن سے بالکل مختص ہیں۔

افسوس ہے کہ پہلے ہی سے اس علم کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے، اور اگر ملتا بھی ہے تو فارسی میں یا ایسی اردو میں جو محض چیستاں بن کر رہ گئی ہے، تاہم کتب سیاق و دیگر قدیم دستاویزات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری پرانی حکومتوں کا نظم ونسق نہایت مستحکم و وسیع تھا، حالانکہ اس وقت ایسے وسیع ذرائع و وسائل موجود نہ تھے جو آجکل ہماری ضروریات کو سہل ترین بنا رہے ہیں، دیسی کاغذ کے یہی چھوٹے چھوٹے پرزے تھے، جن کے ذریعہ حکومتوں کے احکام کی تعمیل کی جاتی تھی، اور بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم معاملات طے پاتے تھے۔

ہر چیز کا ایک اصول اور ایک قاعدہ معین تھا جس کی تعمیل کی جاتی تھی، ضروریات سلطنت کے لحاظ سے دفاتر و عہدے بھی خاص تھے، مثلاً دفاتر دیوانی و مال و استیفا، (محاسبی) قانون گوئی (بندوبست) فوج و پولیس، قضا، و احتساب (مذہبی عدالت) بد عت (آبکاری) ڈاک چوکی، سیاہہ اور عرض مکرر (صیغۂ توثیق احکام) ان کے علاوہ سوانح نگاری، طبابت، صنعت و حرفت، تعلیمات، دار الضرب اور امور خارجہ وغیرہ جیسے اہم سررشتوں سے متعلق بھی مواد ملتا ہے۔

آئندہ سطور میں ہم ان مباحث کا نہایت مختصر سرسری اور اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں، جو

فن سیاق کے اہم عنوانات یا اجزاء کہے جا سکتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ سیاق کا موضوع مد و رقم ہے، اور ان کی اس فن میں بڑی اہمیت ہے، لہذا سیاق دانوں نے بلحاظ ضرورت اس کی اقسام بھی خاص خاص وضع کی ہیں، اور بسا اوقات تو الفاظ اور اسماء ہی کی مدات قائم کر دی ہیں، مثلاً باقی و تتمہ و مقررہ، مد سیاہہ، مد جمع و خرچ، کھتاؤنی، روزنامچہ، بقطی نامہ، فوتی نامہ، اور اسماء کی مد مثلاً قاسم، محمود، احمد، حسن، حسین وغیرہ، اور مدات کی حقیقی اقسام بہرمد، دو قلمی، چہار قلمی، ہشت قلمی، شانزدہ قلمی، مدات شکمی اور گوشوارہ ہیں، پھر ان کے خاص اصول بھی مقرر کر دیے گئے کہ کس موقع پر کونسی مدات استعمال کی جانی چاہییں۔

مباحث بارز و حشو و ایراد

قرار داد قیمت یا تنخواہ وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے کے موقع پر جس چیز کو نمایاں حیثیت اور خاص مقام دیا جاتا ہے وہ بارز ہے، اور اس کی تفصیلات جو سیدھی اور بائیں جانب علی الترتیب بتائی جائیں وہ 'حشو و ایراد' کہلاتی ہیں۔

الفاظ تمیز

یہ بھی فن سیاق میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، یعنی کسی خاص لفظ کو بتانا مقصود ہو تو اس کے ساتھ خاص اسماء کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً کسی منصب دار یا سپاہی کے لیے لفظ شخص' یا 'نفر' استعمال کریں گے، علیٰ ہذا گھوڑے کے لیے "راس" اور اونٹ کے لیے 'مہار و نفر' اور ہاتھی کے لیے 'زنجیر'، پالکی کے لیے 'منزل'۔ 'سایبانی' کے لیے 'ظل'، ہتھیار کے لیے 'ضرب و قبضہ' کتاب کے لیے 'جلد'۔ اشرفی اور روپیہ کے لیے 'مہر و مبلغ'۔ ہرن کے لیے 'ڈور'، شکرے کے لیے 'دست'۔ پارچہ کے لیے 'ثوب اور تھان' اور کسی جوڑ دار شے کے لیے 'جفت و زوج' شیر و پلنگ وغیرہ کے لیے 'قلادہ'۔ چھوٹے جانوروں کے لیے 'قطعہ' مالا' وغیرہ کے لیے 'سلک' زربفت و مخمل کیلئے 'طاقہ' رباب چنگ کے لیے 'ساز' کاغذ کیلئے 'دستہ' قالین وغیرہ کیلئے 'فرد' زمین اور آسمان کے لیے 'طبق' طلا، و نقرہ وغیرہ کیلئے تولہ' ماشہ، رتی، رکابی کیلئے 'ظرف' نان کیلئے قرص و گردہ، مروارید کیلئے دانہ، اسی طرح خاص خاص الفاظ کے لیے خاص خاص علامتیں بھی مختص ہیں، مثلاً علامات

ہندسہ اور عربی حروف آنہ پائی کی علامات کے علاوہ دمڑی کے لیے علامت صاد

ٹولی کے لیے ہمزہ اور صاد (ءص) وغیرہ

مباحث سالہائے ترکی | ترکی سال کا دائرہ بارہ سال پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کا استعمال کاغذات عطیات میں خاص طور سے ہوتا ہے، ترکوں کے نزدیک ہر سال ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ ان بارہ سالوں کی تفصیل یہ ہے

(۱) سیچقان ایل	سیچقان بمعنی چوہا اور ایل بمعنی سال، اثر نحس رکھتا ہے	
(۲) اودا ایل	" بیل	اثر سعد
(۳) پارس ایل	" چیتا	" نحس
(۴) توشقان ایل	" خرگوش	" "
(۵) لوی ایل	" نہنگ	" سعد
(۶) ایلان ایل	" سانپ	" نحس
(۷) یونت ایل	" گھوڑا	" سعد
(۸) قوی ایل	" بکری	" "
(۹) بیچی ایل	" بندر	" نحس
(۱۰) تخاقو ایل	" مرغ	" "
(۱۱) ایت ایل	" کتا	" "
(۱۲) تنگوز ایل	" مینڈک	" "

کارخانہ جات شاہی | باورچی خانہ، آبدار خانہ، توشک خانہ، جواہر خانہ، زرگر خانہ، قور خانہ (اسلحہ خانہ)، ابتیاع خانہ (خرید و فروخت)، خوشبو خانہ، میوہ خانہ، کرگراق خانہ (ظروف اسلحہ

و ملبوسات وغیرہ) کتاب خانہ، تنبول خانہ، اصطبل خانہ، فیل خانہ، شتر خانہ، گاؤ خانہ، قوش خانہ (چڑیا خانہ) آہو خانہ، فراش خانہ، زردوز خانہ، تسبیح خانہ، شربت خانہ، رکاب خانہ، نان بائی خانہ، نقاش خانہ، باروت خانہ، چینی خانہ، دخوت خانہ، نقار خانہ، انبار خانہ، مشعل خانہ وغیرہ۔

مباحث چہرہ نویس | سپاہی کا چہرہ اتنا مکمل رکھا جاتا تھا جس طرح آجکل تصویر کشی کے ذریعہ کسی شخص کے خد و خال وضع کیے جاتے ہیں، مثلاً ملازم کا نام، اس کے باپ اور دادا کا نام، قومیت مع تقسیم ذیل کہ اگر ملازم مسلمان ہے تو مغل یا پٹھان، اگر سید ہے تو حسنی یا حسینی، شیخ ہے تو صدیقی یا فاروقی وغیرہ، اسی طرح اگر ہندو ہے تو راجپوت اودکنی ہے یا اور چہرے کا رنگ مثلاً گندم گوں، سبز، سفید، سرخ، بلند قامت ہے یا پستہ قد، پیشانی کا حلیہ کشادہ یا غیر کشادہ، اور اگر اس پر خال ہے یا مسہ یا داغ ہو تو اس کی وضاحت اور ابرو کا حلیہ پیوستہ یا کشادہ آنکھ کا حلیہ آہو چشم، میش چشم، ازرق چشم، گربہ چشم، کور چشم،

اسی طرح حلیہ بینی، و رخسار و گوش و ریش و بروت وغیرہ، ریش میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ ریش سیاہ یا سفید، تراشیدہ یا دراز، کھوسہ (جس کے داڑھی مونچھ نہ ہو) جھبو (گھنی داڑھی) اور چہرہ کے حلیے میں داغ، چیچک، خال، مسہ، زخم، شمشیر، برچھی، تفنگ وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے۔ گھوڑوں کے چہروں میں اقسام نسل مثلاً ترکی، یابو، عراقی، مجنس، تازی وغیرہ، پھر ان کے رنگ، نیلہ بوز، نیلہ کبود، نیلہ سرخنگ، نیلہ گمسی، لاکھوری، کشمشی، سرنگ، سرمئی، ابلق مشکی، سرنگ، سفید، سنجاب، بلور، صندلی، ایسے ہی ہاتھی کا حلیہ اور اس کی اقسام، مست، شیر گیر، سادہ، منجھولا، کربیہ، پھندرکیہ،

ضابطہ ابتیاع خانہ | یعنی وہ سررشتہ جو خرید و فروخت سے متعلق ہے، اس کے متعلقہ عہدہ داروں مثلاً مشرف و تحویلدار وغیرہ کے فرائض کے ساتھ متعلقہ کاغذات کے نمونے بھی بتائے جاتے ہیں،

سررشتہ بخشی گری یعنی سررشتۂ فوج۔ اس سلسلے میں بخشی کے فرائض اور اس کے متعلقہ کاغذات سے تفصیل بتائی جاتی ہے، مثلاً اوراق چہرہ، سیاہہ، چوکی، اوارجہ، تنخواہ، فہرست برطرفی و بحالی، سیاہۂ طلب تنخواہ، سیاہۂ نگہداشت، سیاہۂ برطرفی، اوارجہ مساعدت، سیاہۂ داغ و تصحیح سیاہۂ خزانہ، اوارجہ خزانہ، تمسکات حاضر ضامنی، تصحیح نامہ، تعیناتیاں، سیاہۂ حضور،

نقشۂ فوج بندی برانغار (فوج پیشین جانب راست) جرنغار (فوج پیشین جانب چپ) میمنہ (فوج عقبی جانب راست) میسرہ (فوج عقبی جانب چپ) پیشگاہ۔ دست راست دست چپ، قراول (فوج پیشین و درمیانی) ہراول (حصہ فوج مابعد قراول) غزل (حصہ فوج مابعد ہراول) چنداول (حصہ فوج مابعد غزل)

دستورالعمل ضوابط منصبداران یعنی یک بیس منصبدار سے بیس ہزار کے منصبدار تک کی سالانہ جاگیری تنخواہوں کا اسکیل، داموں میں اور ان منصبداروں کے مدارج درجۂ اول، درجہ دوم وسوم، اسی طرح منصبداران نقدی کی تنخواہوں کا اسکیل،

ضابطہ وضعات یعنی ایسا عمل وضعات جو ہر نقدی تنخواہ دار ملازم کی تنخواہ سے لازماً کیا جاتا تھا، ابواب وضع یہ ہیں: حصۂ اجناس فی صد للعہ، ایام شمسی قمری فی صد ہے، ڈاہہ بلاتصور ١٢ اور خزانہ فی صد ہے، تصور دودامی فیصد چہ، قصور شاہجہانی فی صد صہ

ان ضوابط کے علاوہ چند اور قوانین بھی ہیں جو حاضری، غیر حاضری، رخصت و بیماری کتخدائی، ماتم داری و اضافۂ منصب و استعفاء (محکمۂ کنٹرولر جنرل حسابات) وغیرہ سے متعلق ہیں،

فرائض دیوانیان اکرام حسب ذیل کاغذات دیوان کے سامنے پیش ہوتے تھے، اور ان پر انکے دستخط ہوتے تھے، روزنامچہ جمع و خرچ و قبولیت، تمسکات حاضر ضامنی و مال ضامنی و تتمہ خدمت و یادداشت واقعہ و تصدیق رسالہ بخشیان و سائر چوکی و تصدیق حاضر ضامنی،

روزنامچہ، اوارجہ و جمع و خرچ

تجاویز مختص بہ عہدہ داران بعض عہدہ داروں کو بعض خاص الفاظ کے ساتھ تجاویز کرنی پڑتی تھیں، مثلاً

وکیل مطلق کی تجویز	منظور دارند
پیشدست یعنی نائب کی تجویز	علمیت علیہ
دیوان کی تجویز	ثبت نمایند
پیشدست کی	ثبت شد
دیوان بیوتات	نقل بہ ہند
پیشدست کی	واقف شد
خان سامان	قلمی نمایند
پیشدست	اطلعت علیہ
بخشی	بگذرانند
پیشدست	واقف علیہ
مستوفی الممالک (کنٹرولر جنرل حسابات)	ملاحظہ نمایند
پیشدست	مطلع شد

فرائض خدمات متفرق اس سلسلے میں مختلف خدمتوں کے فرائض اور ان کے متعلقہ کاغذات کے نمونے بتائے گئے ہیں، مثلاً خدمت امین کے فرائض کے تحت متعلقہ افسر کو امور رفاہ عام افزائش مال زراعت تشخیص مال و تقاوی تحصیل رقوم کی تاکید کی گئی ہے، کاغذات کے نمونوں کے سلسلے میں پروانچہ خدمت امین کے علاوہ بعہد وحاضر ضامنی و قبولیت، شرح ضبطی، سیاہہ تشخیص معہ اقسام مختلف و طومار جمع مال و جہات و سائر جہات و پروانہ فوجداری تاکید۔

مچلکہ، حاضری ضامنی قبض الوصول، یاد داشت خدمت قضاء، پروانہ خدمت کروڑی، سیاہہ آمدنی، اوارجہ مال وجہات و سائر جہات یادداشت، خدمت احتساب و واقعہ نگاری وحضور نویسی وروزنامچہ حضور و نرخ نامہ وغیرہ دیئے گئے ہیں،

پیمانہ جات | مقداری پیمانوں میں رتی، ماشہ، تولہ، سیر، من، تانک، ٹنگہ، بہلولی، مثقال، صاع، رطل وغیرہ اور مسافتی پیمانوں میں درعہ، طناب، جریب، بسوہ، کروہ، بگہہ وغیرہ

شرح دام | اس بحث میں یہ بتایا گیا ہے کہ دام کی قیمت روپیہ میں کس قدر تھی، اور کس منصبدار کو کتنے لاکھ دام کی جاگیر کے لیے کتنا روپیہ دیا جاتا تھا۔

تعریفات واصطلاحات | بعض خاص دفتری اصطلاحات کی تعریفیں بھی دی گئی ہیں، جو عموماً دفاتر میں مروج تھیں، مثلاً فرد، بند، طبلق (اصل کاغذات کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کاغذ اوپر لپیٹا جاتا ہے) قیدک (طبلق پر باندھنے کا تاگا) مثل، سیاہہ، اوارجہ، تاریخ (تختہ جات جس میں کئی اشیاء کی رقمیں ہر شے کے لیے ایک کے نیچے ایک لکھی جاتی ہیں) افزون (رقوم آمد وخرچ جو ایک پر ایک لکھی جاتی ہیں) تختہ، دفتر، تصحیحہ (معائنہ موجودہ فوج) مسودہ مبیضہ، ورق داغ (صفحات کے نشان) من ذالک (خرچ کی مد) کھتاونی (مسودہ کاغذ آمد وخرچ) یادداشت، روزنامچہ، سیاہہ، ارستہ (جمع وخرچ یک ماہ زائد از یک ماہ کم از یک سال) جمع وخرچ (حساب آمد وخرچ روزانہ یا ماہانہ یا سالانہ) گوشوارہ (فہرست ابواب مجمل) فہرست، برآورد، پترک (تختہ حساب) جمع وصول باقی (حقیقت آمد وخرچ رقم موجودہ)

اخبار الاخیار

از جناب خواجہ احمد فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

اردو کے قدیم اخباروں میں اخبار الاخیار کا درجہ بہت بلند ہے، جو سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے شائع ہوتا تھا، اس نے ہمیں مغربی علوم سے روشناس کرایا، اور "دیسی زبان" کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے اصول کی پرزور حمایت کی۔

اخبار الاخیار نام کے کئی پرچے نکلے ہیں، لکھنؤ سے دو اخبار اسی نام کے شائع ہوئے، ایک ۱۸۷۲ء میں اور دوسرا ۱۸۸۳ء میں اجرا ہوا[1]، دہلی سے بھی ایک اخبار اسی نام کا یکم اپریل ۱۸۸۷ء سے نکلنا شروع ہوا[2]، لیکن یہاں اس اخبار کا ذکر مقصود ہے جو ان سب سے پہلے یعنی ۱۸۶۶ء میں، مہینہ میں دوبار، منشی فرمان علی خاں کی ادارت اور مطبع چشمۂ نور قصبہ مظفرپور ضلع ترہت میں سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے شائع ہوتا تھا، ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوسائٹی ۲۴ مئی ۱۸۶۸ء کو قائم ہوئی تھی،

اختر شاہنشاہی میں لکھا ہے:

"اخبار الاخیار، متعلقہ سینٹیفک سوسائٹی بہار، از مطبع چشمۂ نور قصبہ مظفرپور ضلع ترہت، ہندرہ روزہ، آٹھ ورق اوسط، سالانہ بارہ روپئے، محصول تین روپئے، میر مجلس نواب سید محمد تقی خاں صاحب بہادر آنریری مجسٹریٹ، سکریٹری مولوی سید

---

[1] اختر شاہنشاہی مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ص ۹ [2] ایضاً

امداد علی خاں صاحب بہادر، اڈیٹر منشی قربان علی خاں[1]، اجراے ۱۸۶۸ء[2]

یہ اخبار بائیں طرف سے بطرز انگریزی لکھا جاتا تھا، در اصل ارادہ یہ تھا کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھاپا جائے گا،[3]

۱۵ اپریل ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں مولوی سید امداد علی سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی بہار کی وہ تقریر درج ہے جو انھوں نے "بحضوری ممبران کمیٹی" کی تھی، ہم اس کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں، جس سے اس اخبار اور سوسائٹی کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے:

"بانیان سوسائٹی ہذا کا مطلب دلی یہ ہے کہ علوم یورپ (جو واسطے ترقی دولت و جاہ دنیوی کے نسخۂ اکسیر اور کبریت احمر سے زیادہ مفید اور پرتاثیر ہیں) اس ہندوستان میں پھیل جاوے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ جس طرح اہل انگلستان نے کتب علمیہ میں گریک اور لاطینی اور عربی و سنسکرت کو زبان انگریزی ترجمہ کرکے اپنے ملک میں پھیلایا اور بعد تحقیقات کلی اور تجربات قرار واقعی کے ہر علوم و فنون کی تکمیل کرکے ہزار در ہزار طریقے ترقی مال و دولت اور ترفع جاہ و عزت کے ایجاد کیے ہیں، اسی طرح سے اہل ہند کتب علمیہ زبان انگریزی کے بذریعہ ترجمہ بزبان ملکی اپنے ملک میں پھیلا کر بزور ذہن و ذکا اور عقل رسا اپنے صدہا طریقے واسطے ترقی مال و جاہ کے ایجاد کریں گے، اور ہزارہا کتابیں اپنے تجربہ اور تحقیقات کی تصنیف و تالیف کرکے نہ صرف اپنے ملک کی ترقی اور سرسبزی میں کوشش کریں گے، بلکہ اپنی روشن ضمیری کے پرتوے سے دوسرے ممالک کے شائقین علوم کے دلوں کو بھی پر نور اور مسرور فرما دیں گے۔"[4]

۱؎ کذا، لیکن اخبار الاخیار میں قربان علی خاں ہے، ۲؎ اختر شاہنشاہی: اختر الدولہ حاجی محمد اشرف ص ۹، ۳؎ اخبار الاخیار مظفر پور مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۶۹ء، بشکریہ محبی شاہ مقبول احمد صاحب ۴؎ ایضاً ص ۲۲۰-۲۲۱

آگے لکھا ہے کہ ہم دیسی زبان کی اعلیٰ یونیورسٹی کے قیام کی کوشش بھی کر رہے ہیں،

یہاں "دیسی زبان" سے مراد اردو ہے، اس اخبار کا طلوع اس پرآشوب احول میں ہوا تھا جب اردو ہندی کی بحث چھڑ چکی تھی[1]، بابو شیو پرشاد اور ان کے ساتھی اردو کی مخالفت کر رہے تھے، لیکن کچھ لوگ اس کی حمایت پر بھی کمربستہ تھے، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں منشی حکم چند پروفیسر قدیم دلی کالج نے ایک محققانہ اور مدلل مضمون اردو کی ابتدا، اس کی ضرورت اور اہمیت پر لکھا تھا، غرض اس نئی تحریک پر خوب گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں اور تائید و تردید میں بہت سے مضامین شائع ہو رہے تھے، اخبار الاخیار کے صفحات بھی اس بحث سے خالی نہیں ہیں،

۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں "تقریر بلاغت تنویر جناب سید وارث علی صاحب مدرس و سپرنٹنڈنٹ مدرسہ متعلقہ سینٹیفک سوسائٹی صوبہ بہار، مقام مظفر پور دربارۂ بحالی رواج اردو" مندرج ہے، یہ در اصل ان اعتراضات کا جواب ہے جو سید وارث علی کے مضمون بعنوان "بحالی رواج زبان اردو و بحروف فارسی" مطبوعہ اخبار الاخیار مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۶۹ء پر ہوئے تھے، معترضین نے ناگری حروف کے رواج پر زور دیا تھا۔

سید وارث علی کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اردو تمام ہندوستان کی عام زبان ہے۔

(۲) اردو کا خط مثل زبان اردو کے ٹھیک ملبوس زبان مذکور کا ہے، اس لیے کہ اس رسم خط میں عہد بہ عہد نئے الفاظ کے شمول کے ساتھ تغیر ہوا ہے،

(۳) ہندی یا سنسکرت کے رواج سے عوام کا نقصان ہوگا، اس لیے کہ سنسکرت کا فائدہ ازروے اصول مذہبی صرف برہمنوں کو پہنچ سکتا ہے۔

۱؎ خطبات گارساں دتاسی ص ۵۳۷ تا ۵۴۹۔ سولھواں خطبہ ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء۔

(۴) ناگری رسم خط ہندی کے لیے محمد شاہ کے زمانے سے رائج ہوا ہے۔

(۵) اردو آسان اور سنسکرت، ناگری خط اور دیا کرن مشکل ہے۔

اس تقریر کا بقیہ خلاصہ ۱۵ رمئی ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۶) "جس قدر کتابیں علوم اہل یورپ کی زبان اردو مروجہ میں جیسا کہ ان کا ہونا قرین مصلحت تھا، ترجمہ و تصنیف ہوئی ہیں، ناگری میں نہیں پائی جاتیں۔"

(۷) اردو کسی قوم کی خاص زبان نہیں ہے، بلکہ اس زبان میں ہندو مسلمان، انگریز و یہود وغیرہ جملہ سکنائے ہند شریک ہیں، اور ہر ملت و مذہب کی کتابیں اور ہر قسم کے علوم اسی زبان میں جاری و ساری ہیں، حتیٰ کہ ترجمہ چاروں وید ہنود اور توریت و انجیل اور زبور اور فرقان مجید کا مع ترجمہ کتب انگریزی بابت ہر قسم علوم و فنون کے اس زبان میں موجود ہیں۔"

اسی اشاعت میں بعنوان "کارسپانڈنس" پنڈت شیو ناتھ سکریٹری لٹریری سوسائٹی فتح پور کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، جس کے اہم نکات یہ ہیں:

(۱) اردو "درست شدہ زمانہ حال کی ہندی زبان" ہے، پس ہم اردو کا عدالتوں میں جاری رہنا مناسب تصور کرتے ہیں، اور "بجائے حروف مجاریہ حال" کے دیوناگری جاری کرنے کی بھی ہماری رائے نہیں ہے۔

(۲) اردو کا رسم خط مناسب ہے اور بہت کم جگہ گھیرتا ہے۔

(۳) اردو کی بہت ترقی و تہذیب ہو چکی ہے۔

(۴) اگر اردو فارسی خط میں منظور نہیں تو پھر رومن کا جاری ہونا بہتر ہے۔

مرزا غالب دہلوی کا انتقال ۱۵ رفروری ۱۸۶۹ء کو ہوا ہے[۱]۔ یکم جون ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار

[۱] رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۵ء ص ۲۴۷

میں "چند قطعات تاریخ وفات مرزا غالب نور اللہ مرقدہٗ از سیدنا ابو العلا حضرت شاہ محمد یحییٰ ابو العلائی" مندرج ہیں، ان دو قطعوں میں سے ایک قطعہ نقل کیا جاتا ہے:

مرزا نوشہ جناب غالب
در فنِ سخن وری یگانہ

از اہل سخن ربودہ دلہا
در شعر بطرز جادوانہ

کیفیت نثر او چہ گویم
دارد انداز دلبرانہ

باشد بہ کلامِ او عجب لطف
معشوقانہ و عاشقانہ

از کشور ہند تا بفارس
زد کوس کمالِ خسروانہ

در وجد آرد قلوب پاکاں
قولش در قالب ترانہ

مستانہ کلام او بخشد
کیف و سکرے شبانہ

ایں اشعارم بہ مدحتِ او
نبود گفتارِ شاعرانہ

ہر آنچہ کہ گفتہ ایم یاراں
باشد قولِ محققانہ

بگذاشتہ خاک پاک دہلی
در شوقِ بہشتِ جاودانہ

سال آں بے نظیر یحییٰ
گو بودہ نظیریٔ زمانہ
۱۲۸۵ھ

۱۵ رجون ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں مولوی وارث علی کی ایک کتاب "علم تعمیر و پل بندی" کا ذکر ہے کہ "اگر وہ پسندیدہ رائے ممبران سوسائٹی ہو تو گورنر ممالک مغربی و شمالی کو واسطے حاصل کرنے انعام بھیجی جائے"، اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے ایک سیلکٹ کمیٹی مقرر کی گئی۔

اسی پرچہ میں مندرجۂ ذیل کتابوں کا ذکر ہے، جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں:

مصنف	نام کتاب	نام علم
مولوی عبد اللہ عبیدی، پروفیسر ہگلی کالج	رسالہ تمدن	پولیٹیکل اکانومی
"	رسالہ ہیئت	اسٹرانمی
"	مناہل جغرافیہ	جغرافیہ
رائے سوہن لال، سپرنٹنڈنٹ نارمل اسکول	رسالہ جبر و مقابلہ	الجبرا
"	رسالہ طبیعات	نیچرل فلاسفی
"	رسالہ علم حیوانات	جیالوجی (کذا)
"	رسالہ معدنیات	بوٹانی (کذا)
میر صادق علی، رڑکی کالج	رسالہ مثلث	مثلث
"	فن عمارت	انجینیری

سوسائٹی کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اور باقی کے چھاپنے کی تیاری ہے۔ اس کے علاوہ مصر سے بھی نیچرل فلاسفی اور مارل فلاسفی کی وہ کتابیں خریدنے کا ارادہ ہے جو یورپی زبانوں سے عربی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ سوسائٹی نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ "ایک مترجم واسطے ترجمہ کتب انگریزی وغیرہ کے، بنظر فائدہ عام اور پھیلانے علوم یورپ کے مقرر فرماوے اور گورنمنٹ ایک راہ ایسی نکال دے کہ جس سے اقسام علوم یورپ کا ہندوستان میں عموماً پھیل جاوے۔" حکومت نے اس کا جواب "چٹھی مورخہ ۲۹ جولائی ۱۸۶۸ء" میں ہمت افزا دیا ہے۔

۱۵ جون ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں درج ہے کہ "عند التحقیق یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس زمانہ تک کل کتابیں انٹرنس کے درجہ تک کی زبان انگریزی سے بزبان ملکی ترجمہ ہو چکی ہیں،

صرف بڑے درجہ کی علوم کی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے، ان میں سے بھی چند کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں۔"

اسی اشاعت میں یہ اطلاع بھی ہے کہ "چھاپہ خانہ سنگی خاص طیار ہوئے، چنانچہ مبلغ مالصد واسطے خرید چھاپہ خانہ کے بمقام کلکتہ روانہ ہو چکا ہے، بعد پہنچنے اس کے، کتابیں مع اخبار بذریعہ چھاپہ خانہ خاص کے چھاپے جاویں گے۔"

سوسائٹی کی ان خبروں کے ساتھ اس کے مقاصد کی بھی وضاحت کی ہے:

"منشا اس سوسائٹی کا یہ ہے کہ بذریعہ اس سوسائٹی کے مدرسہ قائم ہو کے انواع علوم درجہ اعلیٰ، بذریعہ ترجمہ زبان ملکی کے اس میں پڑھائے جاویں اور اقسام ہنر مثل فن کشت کاری اور آہن گری اور درودگری وغیرہ بذریعہ استادان اہل یورپ اور اہل ہند کے عام اہل حرفوں کو سکھائے جاویں، اور ان کا عمل کرایا جائے۔"

۱۵ جولائی ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں مولوی وارث علی کی ایک تقریر درج ہے، جس میں انھوں نے سرسید کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے:

"مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر جج اسمال کاز کورٹ بنارس جو بتقریب سیر شہر لندن، تشریف فرماے شہر عدن ہوئے .... تحریر فرماتے ہیں کہ الحمد للہ اردو کی شاہنشاہی شہر عدن تک قائم و برقرار ہے، اور عدن کے باشندے اردو میں بے تکلف گفتگو کرتے ہیں۔"

اسی اخبار میں دوربین، جلوۂ طور اور پانیر کے حوالے سے وہابی تحریک کے متعلق ایک اہم خبر درج ہے:

"پانیر میں لکھا ہے کہ وہابیوں سے اب جیل خانہ آباد ہوتا جاتا ہے، ایک پیر باشندہ داناپور اور دو مشہور، وہابی راج شاہی کے، اور ایک مشہور مولوی مالوہ کا، جنھوں نے

سرحد کے پار نو بھرتیاں اور روپیہ بھیجا تھا، اور شہادت کا خیال خام پکایا تھا۔

آہستہ آہستہ صحیح سلامت ہر ایک جیل خانہ میں پہنچا"۔

۱۵ اگست ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اقتصادی پریشانی کا ذکر ہے کہ "روزانہ تین ہزار من غلہ بیرونجات کو بذریعہ ریل روانہ ہوتا ہے، اس لیے بارہ سیر گیہوں کا نرخ ہوا ہے"۔

یکم اگست ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں چند دلچسپ تعلیمی خبریں اور علمی مضامین "نیر اکبر" کے حوالہ سے لکھا ہے:

"پنجاب کے ڈائرکٹر بہادر نے حکم دیا ہے کہ انگریزی مدرسوں میں علوم دیسی زبان میں سکھائے جائیں۔ واقع میں یہ تجویز بہت پسندیدہ ہے، ہم کو یاد ہے کہ پرانے کالج دلی میں بھی یہی قاعدہ عمدہ جاری تھا[1]۔ ہمارے نزدیک اس کا اجرا ہونا سب جگہ مناسب ہے"۔

ایک مضمون کا عنوان ہے "تحریک صاحب انگلش مین دربارۂ تعلیم درجہ اعلیٰ بزبان ملکی"۔ اس میں لکھا ہے:

"یہ جو شور مچا رکھا ہے کہ ہندوستانی یا اور کوئی زبان مروجہ ہندوستانی علوم و فنون کے قابل نہیں ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ اس سے یہی سمجھا جاوے گا کہ زبان ہی بنیاد علم ہے نہ کہ علم بنیاد زبان۔ ہر ایک زبان کی تکمیل اس وقت ہو سکتی ہے جب فوائد علمیہ اسی زبان میں حاصل کیے جاویں، اور وہ زبان استعمال میں لائی جاوے"۔

یکم اگست ۱۸۶۹ء کے پرچے میں ہے

"فرینڈ آف انڈیا کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ آج کل بھی زبان ملکی میں کسی کتاب

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرحوم دلی کالج از ڈاکٹر عبدالحق اور دلی کالج میگزین کا قدیم دلی کالج نمبر مرتبہ راقم الحروف: ۱۹۵۳ء

درسیہ کی محتاجی نہیں ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ زبان اردو میں سب درسیہ کتابیں موجود ہیں، اور ان میں سے بعض کتاب بہت عمدہ ہے ...... روڑکی انجینیرنگ کالج اور آگرہ اور لاہور کے میڈیکل کالج کا ورناکلر ڈیپارٹمنٹ اس بات کا ثبوت کامل ہے کہ اردو زبان کو یہ قابلیت حاصل ہے کہ بذریعہ اس کے تعلیم علوم یورپ کی بخوبی ہو سکتی ہے"۔

اس کے بعد یوروپین زبانوں سے اردو میں جو تراجم آگرہ کالج، ڈاکٹر اسپرنگر اور دلی ورنیکل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے[1]۔

۱۵ اگست ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں ایک اور ایسا ہی مضمون "دربابِ تعلیم اہل ہند بزبان ملکی" درج ہے، جو انگلش مین سے نقل کیا گیا ہے، اسی اشاعت میں غبارۂ جدید کی تیاری کی بھی خبر ہے، اس قسم کی سائنسی خبریں اخبار الاخیار میں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔

۱۵ جولائی ۱۸۶۹ء کے اخبار میں علم جر ثقیل اور مروارید کے پیدا ہونے کا بیان ہے، ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں شیشہ جوڑنے، آب نقرہ تیار کرنے، "شیر آمیز" سے پانی علیحدہ کرنے، برف جمانے، چیچک کے داغ دور کرنے کی ترکیبیں اور دیگر صناعات کا حال درج ہے۔

سائنسی علوم کے روشناس کرانے میں قدیم دلی کالج نے بڑی خدمت انجام دی ہے، لیکن پروفیسر رام چندر کے مفید الناظرین (اجرا ۱۸۴۵ء) اور سائنٹفک سوسائٹی بہار کے اخبار الاخیار (اجرا[2] ۱۸۶۸ء) یا سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ تک عشق کی

[1] اخبار الاخیار، مظفر پور: یکم اگست ۱۸۶۹ء ص ۳۱۳ [2] اخبار الاخیار کس تاریخ کو نکلنا رہا، صحیح نہیں معلوم لیکن ۱۸۷۳ء میں سر جارج کیمبل نے بنگال کے ہندوستانی پریس کے

(بقیہ حواشی ص ۳۸۴ پر)

ایک جہت" نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ سب ایک ہی سلسلہ کی چیزیں اور ایک ہی ارتقائی زنجیر کی کڑیاں ہیں، اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کے اثر سے جو نئی شش جہت قائم ہوئی یا نیا نقطۂ نظر پیدا ہوا، اس کی تعمیر میں ان اخباروں کا بڑا حصہ ہے، جس کو نظرانداز نہیں کیا سکتا۔

(بقیہ حواشی ص ۳۸۳) بارہ میں جو تحقیقات کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ۳۸ اخبار نکلتے تھے، جن میں اخبار الاخیار مظفرپور بھی تھا، بحوالہ میموائر زسر جارج کیمبل۔

۳؎ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی ۱۸۶۲ء میں قائم ہوئی، اور ۱۸۶۶ء میں اس کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شائع ہوا۔

سلیمان نمبر

معارف کا سلیمان نمبر جس کا شائقین و قدردان معارف کو مدت سے انتظار تھا مئی میں شائع ہوگیا، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور ان کے علمی و دینی، قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے، پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین اور مقالات ہیں، اس کے بعد مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں متعدد منظومات اور قطعات تاریخ ہیں، یہ نمبر معارف کے مستقل خریداروں کو عہ میں اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک کے چار روپے میں دیا جاتا ہے، صرف ۱۵ سو چھپا تھا، تھوڑے نسخے اور رہ گئے ہیں، جلدی کیجئے۔

(مرتبہ شاہ معین الدین ندوی)

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

سید عبدالحکیم صاحب دسنوی

اعظم گڈھ

مخدومی زاد لطفکم

السلام علیکم، آپ کے خطوط یکے بادیگرے ملے، سب سے پہلے تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کو جان نو اور قوت تازہ بخشی، اور آپ کو آپ کی اس سر نو "جوانی" پر مبارکباد دیتا ہوں، کتنی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی عیادت اور ملاقات کے لیے آپ تک پہنچوں، مگر ذاتی حالات اور دوسرے مشاغل نے فرصت نہ دی، وطن کی مہجوری کو ایک سال سے زیادہ ہوگیا، اور اب اس کی زیارت کے لیے اولین فرصت کا جویاں ہوں، اور عید اضحیٰ کے بعد آخر مئی میں اس کے دیدار کی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہوں،

کتنا عزم صمیم تھا کہ قومی ہنگاموں میں شرکت نہ کروں، امروہہ کے اجلاس جمعیت العلماء سے خطوط اور تار آئے، مگر ٹالتا رہا، کہ صحت کا قوام اتنا بگڑ گیا ہے کہ ذرا بے احتیاطی روزانہ کے پروگرام میں ہوئی اور اس نے جواب دیا، مولوی مسعود علی صاحب کی تقریب سے واپس آرہا تھا کہ آنکھیں جوش

کرائیں، یہ طوفان کم ہوا، تو زبان میں چھالے پڑ گئے، یہ اچھے ہوئے تو بیچ کی خلش نے ستایا، اس سے نجات ملی تو دانتوں میں درد کی نوبت آئی، زخم بننے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ رات ہی کو نشتر سے خون فاسد نکلوانا پڑا، پرسوں مولانا حمید الدین صاحب کے ہاں صرف ۸ میل موٹر کار پر گیا، ۱ بجے دن کو واپس آیا تو زکام کی خبر ہے، بہرحال یہ زندگی اب یوں ہی نشیب و فراز میں بسر ہوگی، اس کا کیا شکوہ الحمد للہ علی کل حال۔

امروہہ نہ جانے کا قطعی ارادہ تھا، کل مولوی احمد سعید صاحب ناظم کا آخری تار آیا کہ "تمہاری ضرورت بیحد ہے، ضرور آؤ"۔ ایک ندوی برادری کے اہل کار امروہہ کا خط آیا کہ آنا لابد ہے، مشکل یہ ہے کہ ہر مجلس میں دو فریق باہم نبرد آزما ہیں، اور دونوں میں عزیز ترین احباب ہیں، اب جا کر کس کی مخالفت اور کس کی موافقت کی جائے، امروہہ میں دوسرا جلسہ "مجلس توسیع نظام علماء" نام جمعیت کے خلاف ہے جس میں مولانا محمد علی اور مولانا عبد الماجد وغیرہ ہیں، ادھر مولانا کفایت اللہ وغیرہ، مولانا کفایت اللہ صاحب کا خط آیا کہ آپ کے آئے بغیر کام نہ چلے گا، ہر جلسہ میں یہ ہوتا ہے کہ داعیوں کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرۂ ارضی کا صرف میری ذات پر مدار ہے، مگر جب جایئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سا کوئی غیر ضروری عنصر نہیں اور مجھ سا کوئی ساذج نہیں، جو یوں خطوط اور تار پر اعتبار کرکے چلا آیا،

یہ قصہ تو اپنی جگہ پر ہے، دوسرا قصہ یہ ہے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب (میرداد) نے المبین نام ایک کتاب لکھی ہے، ہمارے ایک فاضل دوست ڈاکٹر عبد الستار صدیقی پی، ایچ، ڈی، سابق پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی نے اس پر تنقیدی ریویو لکھا، اور معارف میں چھپا، میں نے یہ کتاب خود نہیں پڑھی، دوسری طرف ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد نے نئے سال کی ادبی کتابوں پر انعام کے لیے جو سب کمیٹی بنائی، اس میں سات آدمیوں میں ایک میں بھی تھا، دو صاحبوں نے ان میں سے اپنی کتابیں خود پیش کی تھیں اور رائے سے محروم رہے، باقی ۵ رہ گئے، رشید صدیقی، ماجد میاں، سجاد حیدر، نیاز فتحپوری،

اور میں، رشید صدیقی صاحب نے تین اور صاحبوں کو ہموار کر لیا تھا، ماجد میاں کی رائے الگ تھی، میں مذبذب کہ شعر الہند نکل گئی، اس لیے کثرت رائے المبین پر ہو گئی، اور انعام اس کو ملا، معارف میں لکھ چکا تھا کہ میں نے کتاب نہیں دیکھی، اور واقعہ بھی ہے کہ ایکاڈیمی کے دفتر نے میرے پاس کتابیں نہیں بھیجیں، بہرحال مخالفین نے میرے اس نوٹ پر نوٹ لکھا کہ ایسی حالت میں سید سلیمان نے المبین پر انعام کی رائے کیسے دی، ادھر مولانا سلیمان اشرف میرے معارف کے نوٹ پر اور تنقید سے آزردہ ہوئے، مولانا شروانی نے بھی اس تنقید کی اشاعت پر آزردگی ظاہر کی،

اب تھیٹر کا تیسرا سین ملاحظہ کیجیے، مسلم یونیورسٹی کا نظم و نسق از سر نو ہو رہا ہے، اساتذہ اور معلمین اوپر نیچے اور ہر طرف کیے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں دینیات کے شعبہ پر بھی نظر ثانی ہو رہی ہے، اس کے لیے کورٹ نے تین آدمیوں کی سب کمیٹی بنائی ہے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب اور مولانا ابو بکر صاحب میں سے کون ریڈر ہو اور کون لکچرار ہو، اول میرے خاندانی عزیز اور دوسرے میرے مکرم دوست (مولانا ابو بکر صاحب جونپوری، مولانا سخاوت علی جونپوری استاد مولانا مصطفیٰ شیر صاحب مرحوم و مولانا یعقوب صاحب مرحوم وغیرہ اکابر دیوبند کے استاد کے پوتے ہیں) کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ، مولوی ابو بکر صاحب کے تقرر میں دوسروں کے ساتھ میری کوشش بھی شریک تھی،

بہرحال اس سب کمیٹی کے صدر نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی ہیں، فخر الدین صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کا خط آیا کہ تحریری اس معاملہ میں اپنی رائے لکھیے، مگر آج مولانا شروانی کا تار آیا کہ ۵ مئی کو سب کمیٹی کا جلسہ علی گڑھ میں ہے، شرکت کیجیے، اس تار نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ امروہہ کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے، جہاں ۳، ۴، ۵ مئی کو اجلاس ہے اور رستہ وہی ہے، ساتھ ہی خیال آیا کہ اگر میری ناچیز کوشش سے علماء کے ہر دو فریق میں مصالحت ہو جائے تو بڑی سعادت ہے، چنانچہ آج دوپہر کو فیصلہ ہوا کہ کل ۳ مئی کو سفر کیا جائے، اور امروہہ ہو کر علی گڑھ پہنچا جائے، جہاں سے نواب سر مزمل اللہ خان

سے بقیہ تین ہزار بھی شاید وصول ہو جائیں، الغرض کل روانہ ہو جاؤں گا، اور آج سر شام وقت

نکال کر آپ کو اپنی رام کہانی سنانے بیٹھا ہوں، مہر تک شاید واپسی ہو۔

بیچ میں حیدرآباد کی سرکار سے اردو ٹائپ کانفرنس کے لیے بلاوا اور تین فرسٹ کلاس کرایہ

کی پیشکش تھی، تیار ہوا مگر عین وقت پر کچھ اضطراب قلب، کچھ مولوی عبدالباری کے ایک خط، کچھ خوف

صحت ان سب نے مل کر ایسا گھبرایا کہ سفر ملتوی کر دیا تھا، اب سفر کے نام سے جی گھبراتا ہے، مگر سفر

مجھکو نہیں چھوڑتا،

ملکی سیاست کا جو حال ہے، وہ داستان تو الگ رکھیے اور جگ بیتی چھوڑ کر اب آپ بیتی سنیے،

آپ کے مدرسہ کا تقاضا ہے، میرے ٹال مٹول سے آپ کو یا آپ لوگوں کو یہ شبہ ہو گا کہ میں "بخل"

سے کام لیتا ہوں، میرا کچا چٹھا سنیے، میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ میرے ماہانہ آمدنی (دو سو) کے اندر

اخراجات ہوں، سو حال یہ ہے کہ عــہ ماہوار میرے باورچی خانہ کا مع مصارف خانہ داری خرچ ہے، عــہ

ماہوار بیوی کی نذر ہیں، پندرہ ماہوار ملازم، دائی، حجام، دھوبی وغیرہ کی تنخواہیں ہیں، سو ہو گئے

دوسرا سو لیجیے، پچیس ماہوار سہیل، پندرہ اور کبھی بیس ماہوار سیدہ، پچیس ماہوار جوتے، کپڑے وغیرہ

کی دو کانوں کیلئے میرے اور تمام اہل و عیال کے مصارف سالانہ کے متعلق جو ادھار ہوتے ہیں،

اور ماہانہ ادا ہوتے ہیں، ستر ہوئے، باقی ۳۰ متفرقات میں خرچ ہوتے ہیں، جیسے بیماری و

علاج، سفر، اتفاقی خریداری اشیاء، غرض یہ میرے حصہ کی رقم ہے، جو بہت کم پس انداز ہوتی ہے،

پس انداز اگر ہوتی ہے تو وہ یونیورسٹی کے پرچوں وغیرہ کی اجرت، میں حتی المقدر اس کو ہاتھ نہیں

لگاتا، اب میرے سالانہ چندوں کی فہرست سنیے، جو دوران سال میں ادا ہوتے ہیں، اور امسال

ہو چکے ہیں، اور ہوں گے، بہ وظائف سالانہ ندوہ ۱۰۰ سالانہ، مدرسہ اسلامیہ سرائمیر عــہ،

مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ عــہ، انجمن امداد غربا، اعظم گڑھ عــہ سالانہ، ندوہ چندہ رکنیت صہ سالانہ،

ایجوکیشنل کانفرنس چندہ رکنیت صہ سالانہ، امارت شرعیہ عــہ سالانہ، انجمن تبلیغ الاسلام انبالہ عــہ سالانہ

انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ تے سالانہ (بابت ۳ سال)

ان میں سے ایجوکیشنل کانفرنس کے چندے کے سوا بحمد اللہ تعالیٰ سب ادا ہوتے ہیں، اور امسال

بھی ادا ہوئے، اب آپ کی رقم عــہ سالانہ ہے، بات یہ ہے کہ جس کا تقاضا سخت ہوتا ہے اسکو

ادا کرنا پڑتا ہے، اب آپ کا تقاضا سخت ہوا تو عــہ سال گذشتہ کے ادا کر دیے، انشاء اللہ

امسال کے بھی ادا کر دوں گا، شاید اسی مہینہ میں یا آیندہ مہینہ میں۔

تاریخ اکابر دسنہ کا حال بہت کچھ مرتب ہو گیا، ایک مہینہ بھی دسنہ میں رہنا ہوا تو پورا

ہو جائے گا، دو چیزیں میرے پاس نہیں ہیں، حافظ محمد جان صاحب کے خاندان کا پورا نسب نامہ

نہیں ملا، یہ ملنا چاہیے، اور استھاوان کا نسب نامہ چاہیے، معلوم نہیں کس کے پاس ہے مولوی مناظر حسن صاحب کے

والد سے گیلانی سے نقل اس کی مل سکے تو حاصل کیجیے،

دادا مرحوم کی ایک مختصر کتاب احوال سلاسل سہروردیہ شیخ احمد چرم پوش، اور شجرہ

قادریہ میں تھی، اس کو چھپوا رہا ہوں، ساٹھ ستر اس میں خرچ ہوں گے، یہ روپیے خاندان میر عظمت علی

صاحب سے بحساب صہ سیکڑہ وصول کرنا چاہتا ہوں، اگر یہ اسکیم کامیاب ہوئی، تو کل کتاب مدرسہ کو نذر

شاید ۸ر فی کتاب قیمت ہو، آخر میں اکابر دسنہ کی تاریخ وفات کے قطعات مؤلفہ حکیم صاحب مرحوم

دیدینا چاہتا ہوں،

آپ بیتی کیفیت کا ایک زیر پردہ نظارہ باقی رہ گیا ہے، روز بروز طبیعت کا رخ دوسری

طرف ہو رہا ہے، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے خط و کتابت جاری ہے، خدا جانے توفیق

ملتی ہے یا نہیں، معیار اتنا بلند ہے کہ نظر کہیں کم جمتی ہے، بہر حال کچھ نہ کچھ "راز و نیاز" کا سلسلہ

جاری ہے، (یہ تمام نہ راز ہے)

مالی سلسلہ کی ایک تازہ کڑی اور ملاحظہ طلب ہے، یونیورسٹی کے سلسلۂ امتحان میں گورنمنٹ
سو پچاس جو دیتی ہے، اس کی تقریب میں، اس کو اس میں سے کچھ واپس لینے کا خیال آیا، اور
انکم ٹیکس کے صیغہ کو لکھ گیا، اطلاعیں آئی ہیں، رجسٹرڈ نوٹسیں آئیں، دو ہزار سال سے زائد
آمدنی پر ٹیکس ہے، اس زد میں میں آتا ہوں، پھر دار المصنفین پر بھی بحیثیت ایک کاروباری کارخانہ
کے یہی مطالبہ ہے. حالانکہ میں نوکر نہیں ہوں، ریاست بھوپال سے ایک مذہبی کام کے لیے
عارضی و غیر مستقل الاؤنس پاتا ہوں، اور دار المصنفین بھی ایک مذہبی و رفاہ عام کا ادارہ ہے،
اور یہ سرکاری انکم ٹیکس سے خارج ہیں، بہرحال اس اصول پر لڑائی ہوگی، نتیجہ حوالۂ خدا،

آج میں نے قلت فرصت کے باوجود خلافِ عادت کہ رات کو آنکھوں سے کام نہیں لیتا،
بعد مغرب لالٹین میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں کیونکہ کل صبح ۹ بجے روانگی ہے، غالباً یہ مطول و مفصل
خط "نصف ملاقات" سے کچھ زیادہ ہی ثابت ہوگا، والسلام

سید سلیمان

۲ مئی ۱۹۳۰ء

اعظم گڈھ

محترمی اطال اللہ بقاءکم

السلام علیکم. کارڈ بحالت انتظار پہنچا، جب آپ کا خط کچھ دنوں نہیں آتا تو میں اس کے معنی
آپ کی علالت سمجھتا ہوں، اس لیے الجھتا ہوں، ادھر میرے خط آپکے پاس باقاعدہ نہیں گئے،
وجہ یہ ہے کہ ادھر مجھے دو تین مجلسوں میں مضمون پڑھنے ہیں، ان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف
تھا، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ۱۰ مارچ کو "ہندوستان میں ہندوستانی" یعنی اردو پر مضمون
پڑھنا ہے، اس لیے کل یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں. واپس آکر شاید اہل و عیال کو وطن تک

پہنچانے آؤں.

پھر اپریل کے شروع میں جامعہ ملیہ دہلی میں "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" پر ایک لکچر دینا ہے، اور ۱۵-۱۶ کو لاہور
کے ادارۂ معارف اسلامیہ میں "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" ایک
مقالہ سنانا ہے، اسی لیے ۱۵ اپریل کو دیسنہ کی شادیوں کی تقریب میں شریک نہ ہو سکوں گا.

جو آپکے قلب کا حال ہے وہی میرے قلب کی کیفیت ہے، خدا جانے یہ کارخانہ کب تک چلے.
سب کچھ کرتا ہوں، مگر دل کی امنگ ساتھ نہیں، خدا رحم فرمائے.

"سلیمانِ ہندی" ۲۶ مارچ کو شاید دیسنہ پہنچیں، بغداد کی ایک انجمن ہدایت اسلام ربیع الاول
میں کوئی مجموعۂ مضامین سیرت تقسیم کرے گی، اس کے لیے مجھ سے بھی تقاضا ہے، مگر مضمون مقرر کردیا ہے،
رحمۃ للعلمین اس سال بھی رہ گئی۔

خیریت ہے - والسلام

سید سلیمان - ۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء

اعظم گڈھ

محترم دام کرمہٗ

السلام علیکم - رمضان کے بعد خاموشی صرف روزوں کا خمار تھا، چند روز مولانا حسین احمد صاحب
کی صحبت میں گذرے، اپنے کسی عزیز کی تقریب میں آئے تھے، ایک روز شبلی منزل بھی ٹھہرے،
تقریب میں ساتھ شریک رہے، مولانا حمید الدین صاحب کے بعد نمازوں میں انکے ساتھ لطف آیا،
سرکار حیدرآباد نے چار ہزار کی بقیہ رقم یکمشت ادا کردی، دار المصنفین کو اگر یہ رقم نہ مل جاتی
تو مالی مشکلات میں مبتلا ہو جاتا، بھوپال نے امسال سو روپیہ کم کردیے اور صرف ایک سعی جاری رکھا.
ارادہ ہے کہ ایک شاگرد کے ذریعہ محرم سے ایک تبلیغی رسالہ اردو میں نکلواؤں، مگر کوئی فنڈ

نہیں، الا یہ کہ لوگ خریداری کریں، انشاء اللہ یہ مفید ہوگا۔

والدہ شمیمہ نے آپ کی تحریک پر حافظ صاحب کی مد میں عمر ماہوار منظور کیا ہے، میں تو آجکل غریب
نادار ہوں، مکان و باغ نے تہی دست کر دیا ہے، مسجد کی مرمت کا کام آپ نے شروع کر دیا، جزاک اللہ۔

اگر اشد ضرورت پڑے تو مجھے بھی "تکلیف" دیجیے۔

الحمد للہ خیریت ہے۔ ننھا بچہ جس کا نام سلمان پڑا ہے، اور تاریخی نام ابو المظفر ہے، اچھا ہے، باغ
کی خیریت لکھیے۔

سید سلیمان، ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء

اعظم گڈھ

عم محترم   دام لطفہ

السلام علیکم۔ والا نامہ بہت انتظار کے بعد ملا، یاد آوری کا شکریہ، میں نے آپ کو اطلاع دی
تھی کہ رحمۃ للعالمین کے حکم کی نصف تعمیل کر دی ہے، یعنی سیرت کمیٹی لاہور کی فرمایش پر اس کا ایک حصہ مسائل
کی تقریر سیرت کے طور پر "رسولِ وحدت" کے عنوان سے لکھکر بھیجدیا ہے، شاید وہ دو جزوں میں آئے،

دیسنہ میں چیچک کی وبا کا حال سنکر تعلق و تردد ہے، اب گرمی میں تو اس کی اور ترقی کا موسم ہے،
کاش کہ اہل دیسنہ نماز باجماعت کا اہتمام کرتے، اور نماز کے بعد اس بلا کی دوری کی دعا، مغرب میں
تو یہ اہتمام ہو سکتا ہے،

غلوں کی نسبت جو سوال ہے اس کا جواب یہ عرض ہے کہ آؤں تو وہ غلہ کام آئے، فروخت میں تو
کوئی قیمت ہاتھ نہیں آئے گی۔

بہادرم عبد القیوم سلمہ سے کہہ دیجیے کہ مزید روپیہ کی اُنہنے حد نہیں بتائی کہ کتنا چاہیے، میں سو پچاس
بھیج سکتا ہوں۔

آجکل سیرت میں دوزخ کی سیر ختم کر کے بہشت کی سیر میں مشغول ہوں، خدا مبارک کرے،

والسلام

سید سلیمان، ۲۷ر اپریل ۱۹۳۲ء

اعظم گڈھ

محترم   دام لطفہ

السلام علیکم۔ آج پانچویں رمضان کی صبح ہے، بحمد للہ خیریت ہے، دسمبر کی اکثر تاریخیں سفر میں
گذریں، کچھ سیاسی اور کچھ قومی، آپ کی اور مولوی قاسم صاحب کی دعوت سفرِ وطن کی تھی، مگر حالات
سے مجبوری ہے، ورنہ میں تو دیسنہ کے رمضان کا اب بھی عاشق ہوں، وطن کے دوسرے جبری مسافروں
کی طرح یہ بھی امید نہیں کہ قوم کی نوکری سے پنشن ملے گی، اور گھر بیٹھنا نصیب ہوگا،

میں نے آپ کے لکھنے کے مطابق قاضی احمد حسین صاحب کو لکھا تھا، انھوں نے دسمبر کے جلسہ میں
شرکت کے ساتھ تحریک کا وعدہ کیا تھا، معلوم نہیں یہ وعدہ کہاں تک وفا ہوا، اور کیا اثر ہوا،

سیرت کی چوتھی جلد آپ ختم کر چکے ہونگے، آپ پر کیا اثر پڑا، آپنے جس شبہہ کا ذکر کیا ہے اس کا
جواب یہ ہے کہ نبی قلوب و ارواح کی اصلاح کے لیے آتے ہیں، مگر قلوب و ارواح اللہ تعالےٰ نے
یکساں نہیں بنائے ہیں، خود ان کے ذاتی ارادوں اور کوششوں کو بھی اس قبول اصلاح
میں دخل ہوتا ہے، آپ دیسنہ میں مریضوں کی اصلاح کے لیے ہیں، مگر جو آپ کیطرف متوجہ نہیں، اور آپکی
حذاقت پر جسکو شبہہ ہے، اور آپ تک آتا بھی نہیں، آپ اس کا علاج کیونکر کر سکتے ہیں، ان ہی کے لیے
خدا کا یہ قول ہے وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ۔ رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا، اور الست کا بھولا ہوا وعدہ
یاد دلانا فرض ہے، منوانا فرض نہیں،

والسلام
سید سلیمان
۵ر رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ
۲ر جنوری ۱۹۳۳ء

ندوہ۔ لکھنؤ

محترم السلام علیکم

میں ۱۱ر جنوری کو اعظم گڈھ سے نکل کر لاہور، لدھیانہ، سہارنپور، تھانہ بھون، دیوبند، دہلی ہو کر کل لکھنؤ پہنچا، دہلی میں آٹھ روز لگ گئے، خالدہ خانم کے عزیز کمال عاطف بے جو کابل میں مشیر قانونی تھے، خالدہ خانم سے ملنے کے لیے دہلی آئے تھے، اور پہنچنے کے دوسرے دن رات کو ہوٹل میں دفعۃً ان کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے چند روز کے لیے جامعہ کا جلسہ بند کرنا پڑا، اور مجھے چند روز کے لیے مزید رکنا پڑا۔

خالدہ خانم سے متعدد ملاقاتوں میں ٹرکی کی مذہبی حالت پر بحث رہی، وہ کہتی رہیں کہ آپ اپنے خیالات ٹرکی کے اخبارات میں چھپواتے رہیے، بہت سنجیدہ، فہیم، متین اور عفت مآب خاتون معلوم ہوتی ہیں، لباس بھی ساتر ہے،

عزیزی عبد العلیم کے لیے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا خط لیکر بھجوا دیا تھا، کیا ہوا، عبد العلی کا وظیفہ منظور ہو گیا، آپ جلد از جلد ان کو لکھنؤ بھیجدیجئے، پتہ: بادشاہ باغ، ندوہ بتا دیجئے، یہاں آکر دفتر میں ان کو ہدایت مل جائے گی،

یہاں تو سخت پالا پڑا ہے، جس سے آم کے چھوٹے درخت جل گئے، اب آپ اپنے باغ کا حال لکھیے کہ اس پر کیا گذری،

میں اس وقت اعظم گڈھ جا رہا ہوں، ۸ بجے صبح کو چل کر ۴ بجے شام کو پہنچوں گا۔

والسّلام

سید سلیمان

یکم فروری ۱۹۳۷ء

ادبیات

عرضِ شوق

از زائرِ حرم جناب حمید صدیقی

اشکِ غم یوں ڈبڈبا کر رہ گئے   جیسے تارے جھلملا کر رہ گئے
جانے والے تو مدینہ چل دیے   ایک ہم آنسو بہا کر رہ گئے
اضطرابِ شوق میں بے ربط سے   چند فقرے لب تک آ کر رہ گئے
دل بھر آیا، آنکھ پُر نم ہو گئی   اف زکی، لب تھرتھرا کر رہ گئے
دل پہ رکھا ہاتھ، ٹھنڈی سانس لی   کچھ نگاہوں سے بتا کر رہ گئے
گنبدِ خضرا کا جب آیا خیال   دل کے گوشے جگمگا کر رہ گئے
سنتے ہی ذکرِ گلستانِ قبا   زخمِ دل سب مسکرا کر رہ گئے
آ گئی جب یادِ محرابِ نبیؐ   ہم ادب سے سر جھکا کر رہ گئے
ہائے وہ جلوے جو اٹھتے ہی نظر   دیدہ و دل میں سما کر رہ گئے
اللہ اللہ ان کی قسمت کا فروغ   جو درِ اقدس پہ جا کر رہ گئے

خیر تو ہے، بات کیا ہے اے حمیدؔ
ایک ہی مصرع سنا کر رہ گئے

شب معراج

از

جناب اثر رام پوری

ہے شب وصل شہِ ہر دو سرا آج کی رات — بقعۂ نور ہے کل ارض و سما، آج کی رات

کتنی پُر نور و حسیں ہے بخدا آج کی رات — ذرے ذرے کی نرالی ہے ادا آج کی رات

حرم کعبہ سے جب شہ نے کیا عزم فلک — وجد میں آگیا خود غارِ حرا آج کی رات

جگمگاتے ہوئے تاروں نے چمک نذر میں دی — جب گیا سوئے فلک بدرِ دُجیٰ آج کی رات

وہ عبائے عربی اور وہ عمامۂ سبز — جس کا ہر پیچ بنا عقدہ کشا آج کی رات

جس طرح شمع پہ پروانوں کا ہوتا ہے ہجوم — تھا یونہی گرد فرشتوں کا پرا آج کی رات

راز کی باتوں کے لائق نہ تھی قاصد کی زباں — اس لیے خود ہی کہا جو بھی کہا آج کی رات

لاکھ پردوں میں ازل سے جو نہاں تھا جلوہ — شوق نے اس کو بھی بے پردہ کیا آج کی رات

ہمکلامی میں نہ تھا گوش و دہن کو کوئی دخل — عقل حیراں تھی کہ کیا کس نے کہا آج کی رات

کفر و ایماں کی کسوٹی تھی یقیناً معراج — کوئی کاذب کوئی صدیق بنا آج کی رات

سائلِ رحم و کرم ہے اثرِ خستہ جگر

در سے محروم نہ جائے یہ بھکاری آج کی رات

شعر الہند حصہ دوم

اس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۷ر (طبع ششم) "منیجر"

مطبوعات جدیدہ

مشاہدات و واردات۔ از جناب ایم عبدالرحمن خاں صاحب، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۵۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۶ روپے، پتہ: ایم ثناء اللہ خاں، ریلوے روڈ، لاہور۔

مصنف روشناس صاحبِ قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اب انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور بعض افکار و خیالات کو مشاہدات و واردات کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے، ان میں ابتداء سے تلاش حق اور حرکت و عمل کا مادہ تھا اس لیے انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف راہیں اختیار کیں، اور ان کا تعلق اسٹوڈنٹس فیڈریشن، کانگریس، مجلس احرار اور مسلم لیگ وغیرہ مختلف جماعتوں سے رہا، اور مذہبی تعلیمات سے بھی پوری آگاہی حاصل کی، آخر میں سلوک و معرفت کے کوچہ میں قدم رکھا، اور اس کے احوال و مقامات کی سیر کی، کسب معاش کے سلسلہ میں کچہری سے تعلق رہا، جو بجائے خود ایک بڑی تجربہ گاہ ہے، ان تمام مراحل میں ان کو جو دینی و دنیاوی و اخلاقی و مادی تجربات حاصل ہوئے اور اس سے جو خیالات پیدا ہوئے ان کو انھوں نے سبق آموز اخلاقی و اصلاحی رنگ میں پیش کیا ہے، یہ کتاب ۲۱ - ۲۲ مضامین پر مشتمل ہے، مثلاً کچھ اپنے متعلق، اولیاء اللہ کی معرفت، سکون قلب کی تلاش، روحانیت کی فتح، عذاب قبر کی ابتداء، اقبال اپنی نظر میں، قائداعظم کی نماز، قائداعظم کا مقام، فرودگاہ محمد بن قاسم، علمائے حق اور ارباب مسلم لیگ، انگریزی نظام حکومت و عدالت، ارباب اقتدار کا اخلاق، پرویز کا اسلام وغیرہ، اس فہرست سے مضامین کی نوعیت کا اندازہ ہوگا، ان سب میں کوئی نہ کوئی دینی یا دنیاوی سبق پیش کیا گیا ہے، اس لیے یہ کتاب دونوں حیثیتوں سے

مفید ہے، اس سے اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتا ہے، اور دنیاوی امور میں بھی بصیرت حاصل ہوتی ہے لیکن قائد اعظم کے دینی و روحانی درجہ اور مولانا اشرف علیؒ سے ان کے روحانی تعلق کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہم ظاہر بینوں کی فہم سے باہر ہے۔

حیات ولی ۔ مولانا رحیم بخش مرحوم دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۶۵۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۳۵ پتہ: مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور،

یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی، ان کے اسلاف کرام اور انکی اولاد و امجاد کا تذکرہ ہے، جو آج سے نصف صدی پیشتر بلکہ اس سے بھی پہلے لکھا گیا تھا، اور اب نایاب تھا، اس لیے مکتبہ سلفیہ نے اس کو دوبارہ شائع کیا ہے، اس زمانہ میں تاریخ اور سوانح نگاری کا موجودہ علمی طرز عام طور سے رائج نہ ہوا تھا، اور اس کے مصنف پرانے مذاق کے بزرگ تھے، اس لیے یہ تذکرہ بھی پرانے طرز کا ہے، اور اس میں کشف و کرامات اور مبالغہ کا عنصر زیادہ ہے، خصوصاً شاہ صاحب کے اسلاف کا تذکرہ تو بالکل تذکرۃ الاولیا معلوم ہوتا ہے، البتہ شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب اور ان کی اولاد کے حالات تاریخی ہیں، ان کے علمی کمالات کا بھی ذکر ہے، مگر شاہ صاحب کے علمی و دینی کارناموں پر جیسی تفصیلی اور جس نوعیت کی بحث کی ضرورت تھی وہ نہیں ہے، حضرت شاہ صاحب کی ذات جامع العلوم بلکہ منبع العلوم تھی اور اس سے علوم پھوٹتے تھے، وہ اپنے دور میں دینی علوم کے مجدد تھے، انھوں نے اس میں نئی روح پھونکی، خصوصاً اسرار دین پر ان کی نگاہ جیسی حکیمانہ اور نکتہ رس تھی، اس کی مثالیں گذشتہ ائمہ میں بھی کم ہی ملیں گی، ان علوم کے علاوہ قوموں اور حکومتوں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور سیاسی، اقتصادی اور تمدنی مسائل پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی جس کے اشارے جابجا ان کی تصانیف میں ملتے ہیں، اس کتاب میں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس کتاب سے اس نامور خاندان خصوصاً شاہ صاحب کی علمی جلالت اور ان کے علمی و دینی کارناموں کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے،

بعض اور خامیاں بھی ہیں، مگر اس سے اس کتاب کی اہمیت میں فرق نہیں آتا، اردو میں ایسی بھی کوئی کتاب نہیں ہے جس میں خاندان ولی اللٰہی کے اتنے حالات بھی مل سکیں، اس لیے حشو و زوائد کے باوجود اس کتاب میں بہت سی کارآمد اور مفید باتیں مل جاتی ہیں، اور ان کی مدد سے ایک اچھی کتاب لکھی جا سکتی ہے، اس لیے اس کمیاب کتاب کی اشاعت ضروری تھی،

کتاب نورس ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۸ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۶ پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ،

دکن کے عادل شاہی سلاطین میں ابراہیم عادل شاہ اپنی علم دوستی اور علما نوازی میں بہت ممتاز تھا، اور اس کا عہد دکن کی علمی تاریخ کا زریں دور تھا، تاریخ فرشتہ جیسی کتاب اسی کی علم نوازی کی یادگار ہے، وہ خود بھی صاحب کمال تھا، شاعری اور موسیقی سے خاص ذوق رکھتا تھا، فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا، موسیقی میں خود بھی مہارت رکھتا تھا، کتاب نورس اسکا نمونہ ہے، یہ فن موسیقی کی کتاب نہیں ہے، بلکہ مختلف راگ راگنیوں میں اس کے اشعار کا مجموعہ ہے، اس میں مختلف راگ راگنیوں کے عنوانات کے ماتحت اس کے اشعار درج ہیں، یہ اشعار اگرچہ دکھنی زبان میں ہیں لیکن ان میں ہندی الفاظ، ہندوانہ خیالات اور ہندو دیومالا کا اثر غالب ہے، اور پورا کلام محاسن شعری سے آراستہ ہے، یہ کتاب ابتک طبع نہیں ہوئی تھی، لائق مرتب نے اس کے مختلف قلمی نسخے فراہم کرکے ان کی مدد سے یہ نسخہ مرتب کیا ہے، کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں ابراہیم عادل شاہ کے مختصر حالات ہیں، اور نورس کی ادبی و شعری حیثیت کا تجزیہ کرکے اس کے خصوصیات اور محاسن دکھائے گئے ہیں، اور اس کے مختلف نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب ہے، کتاب کے آخر میں اس کا اردو ترجمہ، اس کی تلمیحات کی تشریح اور اس کے لغات کا فرہنگ ہے، مقدمہ اور آخر کے ضمیمے فاضل مرتب کے مضامین کی طرح ان کی محنت، دیدہ ریزی اور دقت نظر کا نمونہ ہیں، اس کتاب کی

اشاعت سے ایک قدیم ادبی و لسانی یادگار محفوظ ہوگئی، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں کی زبان اور ان کے علوم سے کتنی دلچسپی تھی،

الحسین۔ مرتبہ جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۲ صفحات، عمدہ کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت مجلد عہ/ مکتبہ جدید انار کلی لاہور،

حضرت امام حسین علیہ السلام اور حادثۂ کربلا کے حالات میں اب اردو میں متعدد مستند کتابیں ہوگئی ہیں، دار المصنفین کے سلسلۂ سیر الصحابہ میں بھی مفصل حالات ہیں، مذکورۂ بالا کتاب مصر کے ایک صاحب قلم عمر ابو النصر کی کتاب الحسین کا ترجمہ ہے، کربلا کا حادثہ ایسا درد انگیز ہے کہ اس کا حال لکھنے میں جذبات پر قابو اور خیالات میں اعتدال قائم رکھنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، اس لیے اس موضوع پر اردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بہت کم افراط و تفریط سے خالی ہیں، مگر الحسین بڑی حد تک اس سے پاک اور صحیح نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور مستند تاریخی روایات پر مشتمل ہے، مگر خشک تاریخ بھی نہیں ہے، بلکہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظمت وجلالت اور واقعۂ کربلا کی اہمیت اور اس کی دینی و اخلاقی حیثیت پوری طرح نمایاں کی گئی ہے، کتاب کے شروع میں منصب خلافت کی حیثیت اور اس سے پیدا شدہ اختلافات اور اس کے نتائج پر صحیح تبصرہ کیا گیا ہے، ترجمہ بھی صاف اور سلیس ہے۔

ثنائے حبیب۔ از جناب بہزاد لکھنوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت اور طباعت بہتر، قیمت: مجلد عہ/ پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ۔

جناب بہزاد اس دور کے ممتاز نعت گویوں میں ہیں، ان کی نعتوں کا ایک مجموعہ اس سے پہلے شائع ہوچکا ہے، ثنائے حبیب نیا مجموعہ ہے، اس کی تمام نعتیں زبان کی سادگی و سلاست کا نمونہ، کیف و اثر سے معمور اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں۔